پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

لوز

آمنہ اقبال احمد

لوفر

آمنہ اقبال احمد

ندیم پبلی کیشنز، کشمیری بازار راولپنڈی

ناشر .... امانت ندیم

اشاعت اول .... فروری ۱۹۸۰ء

اشاعت دوم .... اگست ۱۹۸۹ء

اشاعت سوم .... مئی ۲۰۰۴ء

مطبع .... ایس ٹی پرنٹرز گوالمنڈی راولپنڈی۔

قیمت .... ۲۰۰ روپے

اس ناول کے نام۔ مقام کردار سب فرضی ہیں۔

لوفر

آمنہ اقبال احمد

انتساب

اقبال صاحب کے نام جن
کا تعاون اس کتاب کی
تخلیق کا باعث بنا۔

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل

لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

"ہیلو" نمبر ڈائل کر کے وہ ماؤتھ پیس میں بولا۔

"فرمائیے" ایک مشتعل طنزیہ نسوانی آواز ابھری۔

"میں ... میں ..." پل بھر کو وہ بوکھلا سا گیا۔

"کس سے بات کرنی ہے؟" وہی آواز تھی۔ کرخت جھنجھلی۔

"وہ ... " جس نے بیچارگی سے ریسیور کو دیکھا۔ "وہ۔ مس .....

نفیس احمد سے ......؟"

"شٹ اپ" مزید مشتعل چیخ نما آواز اس کے کان کے پردے کو

چیرتی چلی گئی۔

"اوہ۔ میں ..... میرا نام ..." توہین کا شدید احساس ذہن پر

لیے وہ کہنے لگا ......

"آپ کا نام مونو ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے"۔ لہجے میں شدید حقارت تھی۔ ساتھ ہی کھٹاک سے ساتھ ریسیور رکھنے کی آواز آئی۔

ریسیور کان سے ہٹا کر وہ چند لمحے اسے گھورتا رہا۔ پھر کریڈل پر ڈال کر بھاری سے قدم اٹھاتا باہر کی طرف بڑھا۔

ایک نظر کوریڈور پر ڈالی۔ جہاں ٹیلیفون رکھا تھا۔ وہ کوریڈور کا آخری سرا تھا۔ کوریڈور کا یہ حصہ زیادہ چوڑا لگتا تھا اور شیشوں کی بڑی اور چوڑی کھڑکیوں سے آراستہ تھا۔ اسی میں ایک طرف بہت بڑا پیانو رکھا ہوا تھا۔ اس کے عین سامنے بیٹھنے کے لیے مخملی چپٹے کی گدے دار بنچ تھی۔

طویل و عریض کوریڈور میں قیمتی قالین بچھے تھے۔ اس میں کھلنے والے کمروں کے دروازے پرانی طرز کی صناعی کا نمونہ تھے۔ دروازوں پر بھاری قیمتی پردے لٹک رہے تھے۔ جا بجا خوبصورت سٹینڈوں میں پیتل کے بڑے بڑے منقش گلدان رکھے ہوئے تھے۔ دیواروں پر بڑی بڑی نایاب قسم کی پینٹنگز آویزاں تھیں۔ اور چھت سے قدیم خوبصورت فانوس لٹک رہے تھے۔

آہستہ آہستہ چلتا ہوا وہ باہر کھلنے والے دروازے تک آیا۔ قیمتی مخمل کا بھاری پردہ ایک طرف کھسکاتے ہوئے وہ بڑے سے بھاری قدیم طرز کے مگر بے حد خوبصورت کھدائی کے کام والے پیتل کی پتلی تختیوں سے مرصع

دروازے سے باہر برآمدے میں نکل آیا۔

طویل و عریض برآمدے کا فرش بے حد شفاف اور خوبصورت محرابی ستون سنگِ مرمر کے بنے ہوئے تھے۔ سنگِ مرمر کی کئی چوڑی چوڑی سیڑھیاں اترتے ہوئے وہ نیچے بجری کی سڑک پر آ گیا۔

اُس نے دیکھا سامنے ہی دور تک پھیلا وسیع اور خوبصورت لان تھا۔ نفاست سے کٹی ہوئی گھاس۔ جا بجا اسے پھولوں کے تختے، خوبصورت روشیں جگہ جگہ سفید ترشے ہوئے مرمر کے بنچ۔ دور ایک کونے میں مرمر کی بنی ہوئی سفید کرسیاں درمیان میں میز اور ان پر سایہ کیے خوبصورت چھتری نما چھت تھی، لان کے عین وسط میں تالاب تھا اور اس کے شفاف نیلگوں پانیوں میں تیرتی کلیاں پانی کے خوبصورت فوارے کو جنم دے رہی تھی۔

اس نے اپنے دائیں طرف دیکھا۔ بجری کی سڑک جو اس کے قدموں تلے سے ہو کر کار پورچ میں سے گزرتی مرمریں ستونوں والے برآمدے کے آگے سے ہوتی دور تک پھیلتی دائیں طرف سرسبز پہاڑی کے دامن اور وسیع لان کے کنارے کے ساتھ ساتھ جاتی دور بہت بڑے اونچے آہنی گیٹ میں ختم ہوتی تھی۔ گیٹ سے ہٹ کر اس کی نظریں بجری کی سڑک کے ساتھ ساتھ استادہ پہاڑی پر گئیں۔ جیسے پتھر کی دور تک جاتی بل کھاتی سیڑھیاں درختوں میں بانٹتے ہوئے تھیں۔ سیڑھیاں اوپر جا کر دو شاخوں میں تقسیم ہو گئی تھیں۔ بڑی شاخ

مہمان خانے کو جاتی تھی۔

مہمان خانہ ——— سینڈ سٹونگ مرمر کی خوبصورت دو رویہ عمارت۔
اس طرح کہ پہلی قطار کے کمروں کی چھتیں اوپر والے کمروں کے لئے کھلے ٹیرس کا کام دے رہی تھیں۔ نچلے کمروں کی قطار کے آگے پہاڑی ہموار کر کے چھوٹا سا لان بنایا گیا تھا۔ ایک پتلی سی پتھریلی سیڑھیوں کی قطار اس مہمان خانے کو نیچے آہنی گیٹ سے ملاتی تھی۔

مہمان خانے کے اوپر پہاڑی کی چوٹی پہ سدا بہار پائن میں گھرا گولائی میں بنا شیشوں والا چمکتا سن روم تھا۔

نظریں پھیر کر وہ سیڑھیوں کے اس طرف دیکھنے لگا۔ پہاڑی ڈھلان پہ اگائے گئے سیب کے باغ کے درخت سرخی مائل زرد پکے سیبوں کے بوجھ تلے جھکے جا رہے تھے۔ جا بجا پانی کے چشمے پھوٹ کر انہی درختوں کے بیچوں بیچ چلتے نیچے کی طرف رواں دواں تھے۔

خوبصورت پلکیں جھپک کر اس نے گہری سانس لی۔

سیب کے درختوں سے گھری پہاڑی دائیں طرف چل کر ڈھلان کی شکل اختیار کرتے ہوئے محرابی برآمدے کے آخری سرے پہ جا کر اچانک ہی ختم ہو گئی۔
قدموں کے بل گھوم کر اس نے رخ واپس قدیم طرز تعمیر کی حامل کوٹھی کی طرف موڑا۔
اس کے سامنے اب برآمدے کی وہی سیڑھیاں تھیں۔ جن سے اتر کر وہ ابھی ابھی

بجری کی اس سڑک پر آیا تھا۔

طویل و منقش مرمریں محرابی ستونوں والا برآمدہ دُور تک نظر آکر دائیں اور بائیں مڑ کر نظروں سے اوجھل ہو رہا تھا۔ اسی برآمدے میں کوریڈور والے درمیانی عظیم الشان دروازے کے علاوہ دائیں بائیں اور بھی کئی دروازے اور چھوٹی چھوٹی خوبصورت شیشوں والی کھڑکیاں کھلتی تھیں۔

اندر کتنے کمرے تھے؟ کیا کچھ تھا؟ یہ اس نے ابھی نہیں دیکھا تھا۔ صرف کوریڈور ہی دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ اندر کا حال کیا ہوگا۔

دوبارہ سبز لان کی طرف رُخ کرتے ہوئے اب کے اس نے بائیں جانب نگاہ کی۔ دائیں جانب کی طرح یہاں بھی پہاڑی تھی۔ اس نے نسبتاً اونچی مہمان خانے کے بالمقابل یہاں پہاڑی کو کاٹ کاٹ کر اوپر تلے کئی ٹیرس بنائے گئے تھے۔ سب سے نچلے ٹیرس پر طرح طرح کی گھاس نہایت صفائی سے اگائی گئی تھی۔ اس سے اوپر والے ٹیرس پر نایاب قسم کے گلاب اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ اس سے اوپر والا ٹیرس گردونواح کے خوبصورت پھولوں کے لئے مخصوص تھا۔ اس سے اوپر اعلیٰ قسم کی بیلیں لگی ہوئی تھیں۔

وہ اوپر ہی اوپر دیکھتا چلا گیا۔ سب سے اونچے اور آخری ٹیرس پر اُسے دو گردوں میں سفید مرمر کی کرسیاں اور ان کے درمیان میزیں نظر آئیں۔ گردونواح کے نظاروں کا لطف اٹھانے کے لئے بہترین جگہ کا انتخاب کیا گیا تھا۔

اُس نے مزید اوپر نگاہ کی۔ چھتری جیسی پر ایور گرین پائنز کو جنگلوں آسمان سے لگتے دیکھا تو نگاہیں واپس پلٹ آئیں۔

اُس کے قدموں سے گز بھر کے فاصلے پر سلیٹ نما پتھر کی سیڑھیاں اوپر جاتی بل کھاتی اپنی ٹیریسوں کے ساتھ چلتی ہر ٹیریس کو شاخ دیتی اوپر ہی اوپر چلتی گئی تھیں۔

سیڑھیوں کے بائیں رُخ پر اوپر ہی اوپر کوئی درجن بھر دو رویہ سرونٹ کوارٹرز تھے۔ اسی طریق پر کہ نچلے کوارٹروں کی چھت اوپر والے کوارٹروں کے لئے صحن مہیا کرتی رہے تھی۔ نچلے کوارٹروں کے آگے جگہ بنا کر جس میں [illegible] اور اس کے ارد گرد چھوٹی چھوٹی سرسبز باڑ بھی موجود تھی۔

سرسبز باڑ کے عین درمیان سے پتھر کی سیڑھیاں نیچے آ رہی تھیں۔ سیڑھیوں کو تکتا۔ ہاتھ پیچھے کی طرف باندھے آہستہ قدم چلتا وہ پہاڑی کے دامن تک آ گیا۔ یہی سیڑھیاں نیچے تک آ کر پہاڑی کے دامن میں بنے باورچی خانے میں ختم ہوتی تھیں۔

باورچی خانہ کئی کمروں پر مشتمل نظر آ رہا تھا۔ اور پہاڑی کے دامن میں دُور تک چلتا کوٹھی کے غسل خانوں اور ڈریسنگ رومز کے پچھلے دروازوں اور کھڑکیوں کے بالمقابل واقع تھا۔

کچھ سوچتا دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتا وہ کوٹھی کے اس رُخ گھوم آیا۔

اب دائیں طرف کچن اور بائیں طرف غسل خانوں اور ڈریسنگ رومز کے دروازے اور کھڑکیاں تھیں۔ سامنے کا محرابی ستون والا برآمدہ بھی یہیں آکر خوبصورتی سے سے ختم ہو گیا تھا۔ چوڑے سلیٹ نما پتھروں کے بنے اس راستے پر ہر پتھر کے گرد سبز گھاس اگ آئی تھی، جسے خوبصورتی سے تراش دیا گیا تھا۔

باورچی خانے سے ایک چھوٹا سا Passage کوٹھی تک جا کر ایک دروازے میں کھلتا تھا۔ جو یقیناً کھانے کے کمرے سے قریب تر ہو گا بھیگنے کے امکان سے بچنے کے لیے اسی تیکھے سے Passage کے اوپر چھت بھی تھی۔

وہ آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ کچن کا حصہ ختم ہو گیا تھا۔ بائیں طرف چند سفید سنگ مرمر کی سیڑھیاں چڑھ کر وہ پچھلے برآمدے میں آ گیا۔ یہ برآمدہ بھی سامنے والے برآمدے کی طرح یہاں سے وہاں تک چلا گیا تھا۔ وہی محرابیں تھیں اور وہی مرمریں ستون۔ اس برآمدے میں بھی کوریڈور کا پچھلا دروازہ اسی شان سے کھل رہا تھا۔ دائیں اور بائیں اسی طرح دروازے اور کھڑکیاں بھی کھل رہی تھیں۔ وہی چوڑی چوڑی خوبصورت کھڑکیاں اور منقش دروازے برآمدے کے بیچوں بیچ آ کر وہ رک گیا۔ اس نے سامنے دیکھا۔ برآمدے کی چوڑی چوڑی سفید سنگ مرمر کی سیڑھیاں نیچے چمن میں اتر رہی تھیں۔ جو خوبصورتی سے ترشے چمن کا فرش دائیں سے بائیں تک طویل برآمدے کی پوری لمبائی کے

ساتھ پھیلا نظر آ رہا تھا۔ یہاں بھی نایاب قسم کے پھولوں کے تختے نظر آ رہے تھے
چمن کے بعد اس نے دیکھا بہت محنت سے تیار کی ہوئی کھیتوں میں
مختلف قسم کی سبزیاں اگائی گئی تھیں۔ آلو کے خوبصورت پودوں کے بعد لاتعداد
ان گنت پکے مٹروں کی پھلیوں سے لدے پودوں کی دور تک پھیلی کھیتی نظر آئی
جولائی اگست اور ستمبر؛ قدرت کی جدت پسندی کی داد دیئے بغیر وہ نہ
رہ سکا۔ مٹروں کے بعد اور بھی کئی قسم کی سبزیاں لگی نظر آ رہی تھیں۔

اس نے دائیں جانب چمن کے سائیڈ پر دیکھا۔ چمن کے اختتام پر ہی
پہاڑی ڈھلان پر بادام کا باغ تھا۔ جس کے درختوں میں لگے ان گنت بادام
اپنی پوست میں سے جھانک کر باہر نکل آنے کو بے تاب نظر آ رہے تھے۔
پہاڑی کچھ آگے چل کر سبزیوں کی آخری کھیتی سے آگے نکلتے ہوئے بتدریج
کم ہوتی ختم ہو گئی تھی۔ پھر اسی پہاڑی کے پیچھے سے ایک اور سرمئی رنگ کا
پہاڑی سلسلہ نکل کر آگے کی قطار قائم رکھے ہوئے تھا۔ بادام والی پہاڑی
اور سرمئی پہاڑی کے درمیان باہر کی طرف سے آ رہی بلندی سے آتی چاندی کی طرح
چمکتی شور مچاتی خوبصورت ندی سرمئی پہاڑی کے دامن میں گرتی اس کے ساتھ ساتھ
چلتی نامعلوم منزل کی جانب رواں دواں تھی۔

برآمدے میں ہی چلتا وہ بائیں جانب آ نکلا۔ سیب کے باغ والی پہاڑی
سامنے سے چل کر برآمدے کے اس سرے تک آ کر ختم ہو رہی تھی۔

وہ چمن کے کنارے کنارے چلتا اب سبزیوں کے کنارے پر آگیا تھا
جہیں اختر نے دیکھا۔
اُس کے قدموں سے دو ہی قدم کے فاصلے پر ایک عظیم الشان دومنزلہ
جدید طرز کی محل نما کوٹھی ایستادہ تھی۔
اور یہیں اُسے اندازہ ہوا ۔ قدیم اور جدید طرز کی محل نما کوٹھیوں میں
لیول کا بڑا فرق تھا۔ وہ جدید کوٹھی سے پورے ایک منزل کی اونچائی پر کھڑا
تھا۔ اس طرح کہ جدید کوٹھی کی نچلی منزل کی چھت اُس کے قدموں کے لیول پہ
تھی اور خود وہ کوٹھی کے دوسری منزل کے بالمقابل کھڑا تھا۔ اسی منزل
کے دو کمروں کی کھڑکیاں اور ایک ایک دروازہ اُسکی سمت کھل رہے تھے۔
دروازوں کے آگے نچلی منزل کی چھت پھیل کر کھلے ٹیرس کا کام دے رہی تھی
وہیں جدید طرز کی لوہے کی تار کی سفید دو سنگ کرسیاں اور درمیان
میں کرسیوں کے ساتھ کی گول نازک سی شیشے کی میز رکھی تھی۔ میز پر شیشے
کے خوشنما گول برتن میں کچھ پھل پلیٹ اور چھری بھی رکھے ہوئے تھے۔ پلیٹ
میں کچھ چھلکے بھی تھے۔ جیسے ابھی ابھی کوئی پھل سے شغل کرنے کے بعد اُٹھ
کر اندر گیا ہو۔
ٹیرس کے گرد لوہے کی خوبصورت ریلنگ تھی۔ اور وہ ریلنگ اُس
کے قدموں سے کوئی فٹ بھر کے فاصلے پہ تھی۔

بلڈنگ کے دائیں کونے سے جیپسی کی خوبصورت سیڑھیاں نیچے اُترتی تھیں۔
وہ قدیم کوٹھی کی سبزیوں کی کھیتی کے کنارے کنارے اور جدید کوٹھی کے
ریلنگ کے ساتھ ساتھ چلتا آگے بڑھنے لگا۔

اب ریلنگ ختم ہو چکی تھی۔ وہ سبزیوں کے کنارے کے ساتھ ساتھ مڑ گیا
تھا۔ عین وسط میں پہنچ کر وہ رُک گیا۔ طویل مربع ستونوں والا برآمدہ دور اُس کی
پیٹھ پر واقع تھا۔

قدیم کوٹھی واقعی بہت اونچائی پر واقع تھی۔ جدید کوٹھی کے ریلنگ سے
جو سیڑھیاں نیچے گئی تھیں۔ وہ کافی نیچے جیتی شوریدہ سرزمین میں سے سنگِ مرمر
کے ایک چوڑے سے چبوترے تک آ پہنچ کر ختم ہوتی تھیں۔

پانی کی موجیں سنگِ مرمر کے چبوترے کو کبھی صرف چھو کر، کبھی اُس
سے سر پٹخ کر گزر رہی تھیں۔ تو کبھی پورے چبوترے پر سے بہہ کر گزر جاتی تھیں
چبوترے کے دوسرے رُخ پر بھی سیڑھیاں بنی تھیں۔ یہ سیڑھیاں چبوترے
کی طرح سنگِ مرمر کی تھیں۔ اور اوپر چڑھ کر قدیم کوٹھی تک جا پہنچتی تھیں۔

وہ چند قدم آگے چلا آیا۔ اور اب اُس کے قدم اُنہی سیڑھیوں پر تھے۔
لگتا تھا سیڑھیاں اور چبوترا قدیم کوٹھی کے ساتھ بنے تھے۔ بعد میں جیپسی کی یہ
سیڑھیاں بنا کر اُسے جدید طرز والی کوٹھی سے ملا دیا گیا تھا۔

آہستہ آہستہ اُترتا وہ چبوترے پر پہنچ گیا۔ نیچے شوریدہ سر پانی کا زبردست

شور تھا۔ اس سمت اور تاحدِ نگاہ کی۔ ادھ کھلے باداموں کے پوست نظر آ رہے تھے۔
اور بادام کے باغ کی پہاڑی کے اختتام اور دوسری پہاڑ کے آغاز کے درمیان
سے ندی آبشار بن بن کر نیچے گر رہی تھی۔

اس نے آسمان پر نظر ڈالی۔ پل میں ہی گھرتے سیاہ بادلوں نے ہر سو
جل اول دیا تھا۔

نیچے تاحدِ نظر پانی۔ اوپر تاحدِ نگاہ سیاہ بادل۔ گرم سوٹ پہننے کے
باوجود اسے جھرجھری سی آ گئی۔

جولائی اگست اور اس قدر ٹھنڈ۔ جبکہ کل تک وہ پشاور میں تھا۔ باوجود
ائیر کنڈیشنڈ کمروں کے اور گرمی کے اس کا دم گھٹتا جا رہا تھا۔ اور آج
یہاں۔ موسم کا اس قدر تضاد! وہ قدرت کی رنگینی طبع پر دھیرے سے
مسکرا دیا۔

کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ مڑ کر قدیم کوٹھی کو دیکھنے لگا۔
جسے دائیں بائیں سے پہاڑیاں اپنے گھیرے میں لیے ہوئے تھیں۔ جو
سامنے سے پتھر کی فصیل نما دیوار اور آہنی مضبوط گیٹ سے محفوظ کی گئی تھی۔
اور جو پیچھے سے
شوریدہ سمندر ہی میں جا کھلتی تھی۔
نئی قدرے سے تعمیر کردہ جدید کوٹھی کو بھی دیکھنے لگا۔ دونوں کوٹھیاں سیاہ

گھٹاؤں میں لپٹی شام کے دھندلکے میں اپنی عظمت کی آپ گواہی دے رہی تھیں۔

یہ دونوں کوٹھیاں نصیح احمد کی ملکیت تھیں۔ اس علاقے کے مانے ہوئے رئیس کی۔

جدید طرز والی میں وہ خود مع اپنی اکلوتی بیٹی کے قیام کرتے تھے جبکہ قدیم محل انہوں نے اپنی اسی اکلوتی بیٹی کے نام کر دیا تھا۔ قدیم محل چونکہ خالی ہوتا تھا۔ اس لئے نصیح احمد نے گورنمنٹ کو دے رکھا تھا۔ کرایہ پر نہیں۔ کہ یہ انہیں اپنی ہتک معلوم ہوتی تھی۔ بلکہ ایک غیر متعین عرصے تک۔ جب تک کہ خود انہیں ضرورت نہ پڑ جاتی۔ یا پھر گورنمنٹ کی ضرورت پوری نہ ہو جاتی۔ اور

گورنمنٹ نے اسے ڈپٹی کمشنر کے ریذیڈنس کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ پچھلے پانچ چھ سال سے یہ کوٹھی ڈی سی کے مصرف میں آ رہی تھی۔ نصیح احمد کم ہی اپنی جائے رہائش پر نظر آتے۔ اپنے وسیع کاروبار کے سلسلے میں وہ اکثر و بیشتر ملک سے باہر رہتے۔

پچھلے چند ماہ سے وہ امریکہ میں تھے۔ کل شام افواہ تھی کہ وہ واپس پہنچنے والے ہیں۔

خود وہ کل دوپہر کو ہی یہاں پہنچا تھا۔ رات اس نے ڈاک بنگلے میں گزاری تھی

آج صبیح جہاں کے ساتھ ڈی سی سے چارج لیا تھا۔ آج سارا دن اس کوٹھی میں صفائی وغیرہ ہوتی رہی۔ اس لیے آج رات صبیح الحسن نے ڈاک بنگلے میں گزارنی تھی۔

کچھ اس کوٹھی کو دیکھنے کا خیال تھا۔ اور کچھ فصیح احمد سے ملاقات کرنا اس کا اخلاقی فرض بھی تھا۔ سو وہ ڈاک بنگلے سے چلا آیا۔

سب سے پہلے اس نے ٹیلیفون کر کے فصیح احمد کا پتہ کرنا چاہا تھا کہ آیا وہ واقعی کل شام پہنچ گئے تھے ؟ یا افواہ یوں ہی افواہ تھی؟ پتہ اُن کی اکلوتی بیٹی نے کیا بتانا تھا جس نے چھوٹتے ہی اُسے لوفر قرار دے دیا تھا۔

سیڑھیاں پڑھتے چڑھتے وہ خواہ مخواہ ہی سے مسکرا دیا۔ جانے کیوں؟

کچھ دیر قبل کی کوفت و توہین کے احساس کا اب اس کے خوبصورت چہرے پہ کوئی تاثر نہیں تھا۔ موسم کی رنگینی اور قدرت کی بے پناہ فیاضیوں کا اثر تھا شاید

سبزیوں کی کیاریوں کے کنارے کنارے احتیاط سے چلتا وہ بادامول کے باغ کی طرف رواں تھا۔ باغ کے اس کونے کے ساتھ ملی پہاڑی کے دامن میں ندی کے اونچے کنارے پر واقع وسیع اور بے انتہا خوبصورت سٹ روم تھا۔

بنانے والے کی محنت اور خود اپنے شگفتہ ذوق پر دنگ سا چند لمحے وہ وہیں کھڑا رہا۔

جتنی سٹ روم کے چھوٹے بڑے تمام شیشے یکبارگی جگمگا اُٹھے۔ اُس نے

پلٹ کر دیکھا۔ جدید طرز کے محل میں تمام بیرونی بتیاں جل اٹھی تھیں۔ اور یہ انہی
بتیوں کا عکس تھا۔ کہ منعکس ہو کر قلعہ کے تمام سٹنگ روم کو روشن کر گیا تھا۔

اس نے مزید دیکھا۔ ایک بھاری بھرکم گوریلا نما عورت سامنے کے پیلس
کی میز پر سے وہی کچھ دیر قبل والے ڈنر کے برتن اٹھا رہی تھی۔

اور کمرے کے اندر۔

ایک نازک سا نسوانی ہیولا کھڑکیوں کے پردے برابر کرنے میں مگن تھا۔
اچانک ہی بارش کے موٹے موٹے قطرے پڑنے لگے۔ وہ سن روم کے شیڈ
میں آ گیا۔ اب۔

قدیم شاہکار میں بھی جگمگ جگمگ ہونے لگا تھا۔ اس نے ادھر ادھر نگاہ
ڈالی۔ شام کے سائے غالب آ چکے تھے۔ ہر سو اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ ٹھنڈ
خاصی اتر آئی تھی۔

تیز تیز قدم اٹھاتا بادام کے باغ کے دامن میں چلتا ہوا بڑے کچن کے آگے
سے گزرتا دائیں طرف برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ گیا۔ یہ وہی سامنے والا مرمریں
ستونوں والا برآمدہ تھا۔ وہیں سے وہ پورٹیکو میں اتر آیا۔ اندر کار
میں بیٹھتے ہی گاڑی چلا دی۔ برآمدے کے ساتھ ساتھ بجری کی سڑک
پہ چلتا ہوا وہ سیب کے باغ کے ساتھ گھوم کر مڑا اور سیدھا گیٹ تک نکل گیا۔
گیٹ پہ کی بتیاں بھی جل رہی تھیں اور چوکس محافظ مودب ہو کر کھڑے

ہو گئے تھے۔

"آپ اکیلے ہی صاحب، ہم میں سے کوئی آپ کے ساتھ چلے؟"

وہ دونوں بیک وقت بول اٹھے۔

"نہیں شکریہ۔" اس نے وہی الفاظ دہرا دیئے جو اس نے اس کوٹھی میں داخل ہوتے وقت کہے تھے۔

دراصل آج وہ اس علاقے اور اس کوٹھی میں اکیلے ہی گھومنا چاہتا تھا اس کے بعد اس کا اندر باہر آنا جانا کافی پُر تکلف طریقے پر ہوگا یہ اسے معلوم تھا، اور تکلف سے۔ دوسرے لفظوں میں پابندی سے اسے چڑ تھی۔

گیٹ سے نکل کر اس نے دیکھا۔ پولیس کا کانسٹیبل حسب سابق پہرے پر موجود تھے۔ ان کے سلام کا جواب ہاتھ کے اشارے سے دیتا وہ آگے آیا۔ پہاڑ اب بھی دونوں طرف اندھیروں کی سیٹ میں ایستادہ تھے۔ ان کے بیچوں بیچ بچھی سرمئی سڑک پر وہ جا بجا لگے کھمبوں میں ٹیوب لائٹ کی روشنیوں میں چلا آ رہا تھا۔

دائیں طرف اس نے دیکھا۔ اس کا اور اس کے سٹاف کا لمبے احاطے پر محیط آفس واقع تھا۔ اس سے بھی آگے نکل آیا۔ تو مین گیٹ تھا۔ جو کہ سڑک کی چوڑائی پر واقع تھا۔ اور اندرونی گیٹ سے کہیں زیادہ مضبوط اور اونچا تھا۔ یہاں بھی پولیس کا پہرہ تھا۔

گیٹ سے باہر نکل کر وہ پہاڑی سڑک کی گولائیاں عبور کرتا نیچے بازار
میں اُتر آیا۔ پھر قدرے سیدھی سڑک پر ذرا تیز ڈرائیو کرتا دائیں طرف کچی سڑک پر
ہو لیا۔ یہاں بھی اُسے نسبتاً اُوپر جانا پڑا۔ کرڈواک بنگلہ بھی اُونچائی پر واقع تھا۔

"یار کھانا منگواؤ"۔ اُسے اندر داخل ہوتے دیکھتے ہی ضیغم لحاف سے تھوڑا
سا سر باہر نکال کر لیا۔
"ایک ایک پل گھنٹے رہے ہو میرے خیال میں"۔ وہ کوٹ اُتار کر ہینگر میں لٹکاتے
ہوئے بولا۔
"تمہارے انتظار میں نہیں۔ کھانے کے انتظار میں"۔ وہ ابھی بھی لحاف
کا ذرا سا کونہ سرکائے اُسے دیکھ رہا تھا۔
"یہی تو کہہ رہا ہوں کھانے کے انتظار میں پل پل گن رہے تھے۔ مجھ غریب
کا کون انتظار کرتا ہے"۔ وارڈروب میں سے نائٹ سوٹ نکال کر اس نے
دروازہ بند کر دیا۔
"میرا کہنا مان لیا ہوتا تو آج تمہارا بھی کوئی انتظار کر رہا ہوتا"۔ وہ
ہمیشہ اُسے کسی نہ کسی لڑکی کو چانس دینے کا مشورہ دیا کرتا تھا۔ "اب بھی تم

ہے، جیسے ۔۔۔۔۔" اُس نے لحاف ایک طرف پھینکا اور اُٹھ کر خود ہی
کال بیل پر ہاتھ رکھ دیا۔

اور کامران کو اچانک ہی جیسے یاد آیا۔

"میں اپنا ریذیڈنس دیکھنے گیا تھا"۔ کپڑے بازو پر لٹکائے وہ جیسے
کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"ماشاء اللہ" نعیم واپس بستر میں گھس کر گویا ہوا۔

"جاتے ہی میں نے ٹیلیفون کیا ۔۔۔۔۔"

"سبحان اللہ"۔

"سنو تو"۔ وہ جھنجھلا سا اُٹھا۔

"سن رہا ہوں"۔ وہ واقعی سننے لگا۔

"خاک سن رہے ہو"۔ وہ ڈریسنگ روم کی طرف جانے لگا۔

"بھئی سن رہا ہوں نا۔ تم اپنا ریذیڈنس دیکھنے گئے تھے"۔ اُس نے
بستر سے نکلتے ہوئے لپک کر اُسے جا لیا۔

"اور بھی کچھ کہا تھا"۔ وہ پھر وہیں کھڑا ہو گیا۔

"وہ نہیں سنا۔ پھر کہہ دو"۔ اب کے وہ اُس کے قریب کامران
والے بستر میں گھس گیا۔

"ریذیڈنس بہت خوبصورت ہے"

"وقت وقت کی بات ہے" اُس نے بیزاری ظاہر کی۔
"کیوں؟ میں تمہیں اس ریذیڈنس کے قابل نظر نہیں آتا؟"
"یار سچ پوچھو تو۔۔۔۔" وہ سر کھجاتے ہوئے بولا "واقعی اس قابل نہیں ہو۔۔۔۔" اُس کے لہجے میں زکھا پن تھا۔
"کیوں؟ اپنے ڈیڈ کے یہاں ہماری شان کسی شہزادے سے کم ہوتی ہوتی ہے کیا؟" کامران نے اتراکر کہا۔
"اس میں تو شک نہیں لیکن پتہ ہے یہ کوٹھی بھی کسی کم آدمی کو نہیں ملا کرتی"
"ڈی سی ہی کو ملتی ہے"۔ وہ لاپرواہی سے بولا۔
"اور تم اپنے کو ڈی سی ہی سمجھتے ہو"
"اچھا پلیز اسٹو!"
"ہوں" وہ اچھی طرح لحاف میں دبک گیا۔
"ابھی برف تو نہیں پڑی ابھی۔ کیوں بار بار لحاف میں گھستے جا رہے ہو۔۔۔" اور ساتھ ہی اُس نے اُس پر سے پورا لحاف اٹھا کر نیچے قالین پر پھینک دیا۔
"تم پشاور سے آئے ہو۔ دماغ بند ہوتے ہوتے رہ گیا"۔ وہ تکیوں پر اکڑوں بیٹھتے ہوئے بولا۔ "اپنی تو ہڈیاں سردی سہتے سہتے اکڑ گئی ہیں"

"اچھا اب سنو؟" -

"سننا بھی چکھنا" ۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر لحاف کھینچ لیا۔

"جاتے ہی میں کوٹھی کے اندر گیا۔ تاکہ مسٹر شفیع احمد کو پتہ کروں، اگر

آیا کل شام وہ افواہ کے مطابق واقعی پہنچ گئے تھے۔ ؟ اور اگر وہ موجود

ہوں گھر پر۔ تو اُن سے ملاقات کی جائے۔"

"پھر؟"

"پھر میں نے اُن کی بیٹی سے دریافت کرنا چاہا۔۔۔" -

"وہ عورت ترسنے کی" ۔ وہ کہہ رہی تھی سیدھا ہو گیا۔ نوکر وغیرہ؛ کیا

سب مر گئے تھے اُن کے؟"

"کیوں؟ بیٹی نے پوچھا کیا جرم تھا؟ پھر بیٹی سے بہتر اُن کا پروگرام

کون جان سکتا تھا؟"

"اچھا پھر؟"

"میں نے کہا۔ ہیلو۔" اُس کا لہجہ اچانک شریر ہو گیا۔

"جبھی مجھے ساتھ لے جانے پر اعتراض تھا۔" اُس نے فائر چھوڑت

بولا۔

"بیلیئر نعیم انجم نے خود ہی ٹھگن اور مخفندہ کا کہہ کر ٹالا تھا۔"

"اچھا پھر کیا ہوا؟"

"ہونا کیا تھا - میں نے اپنا نام بتانا چاہا - وہ آگے سے بولیں - انہیں میرا نام پہلے سے معلوم ہے"۔ وہ شرارت سے اُسے تکتا خاموش ہو گیا۔

"کیا مطلب؟ یعنی کہ؟ میرا مطلب ہے ....."

"ہاں ہاں اور پتہ ہے میرا نام کیا بتایا؟"

"جانِ من - جانانِ من ...." وہ لحاف ایک طرف پھینکتا ٹانگیں نیچے لٹکاتے ہوئے فوراً بولا۔

"اوں ہونہہ - اس سے بھی کچھ زیادہ"۔ وہ ہنس پڑا۔

"دلبر - دلربا ....."

"یہ بھی نہیں"۔ وہ مزید زور سے ہنس دیا۔

"اس سے زیادہ تمہارے ساتھ انصاف نہیں ہوگا"۔ سامنے ہی میز پر کھانا لگتے دیکھ کر وہ اُچھل کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

"سن تو"۔ کامران نے اپنا پاؤں اُس کے پاؤں میں اڑا دیا۔ اور وہ اوندھے منہ قالین پر جا گرا۔

"بدمعاش کہیں کے"۔ سیدھا ہوتے ہوتے اُس نے اُس کے ہاتھ میں لگے کپڑے بستر پہ پھینکے اور آگے ہاتھ سے پکڑ کے کھانے کے کمرے میں چل دیا۔

"وہ مارا"۔ کامران زور سے بولا۔

"کیا ہوا؟"

"آج میری عزت افزائی پر عزت افزائی ہو رہی ہے"۔

"ظاہر ہے ڈی ایس پی کی پوسٹ پہ آئے ہو۔" وہ کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"اور پذیرائی کس طرح ہوئی ہے جناب؟" وہ بھی بیٹھ گیا۔

"بتا بھی دو اب"

"ہاں تو وہ کہتی ہیں میرا نام انہیں اچھی طرح معلوم ہے"۔

"مثلاً؟"

"لوفر"۔

اور نعیم کو کباب کھاتے کھاتے اچھو ہو گیا۔

"تم نے ضرور کچھ کیا ہو گا"۔ وہ اچانک بولا۔

"میں اتنا غیر ذمہ دار نہیں ہوں"۔ وہ رعب سے بولا۔

"اور ڈی ایس پی بھی ہو"۔

"اور کیا"۔

"ویسے کامران ایک بات ہے"۔

"کیا؟"

"تم گئے نہیں ہو"۔ وہ انکسار سے بولا۔

"یہ تو تم کہتے ہو۔ ورنہ تو لوگ مرعوب ہوئے جا رہے تھے ما بدولت کو دیکھ دیکھ کر۔"

"اور ساتھ ساتھ پروفیسر سمجھ کر ڈانٹتے بھی جا رہے تھے۔"

اور کامران کے ہاتھ سے پانی کا گلاس چھوٹتے چھوٹتے رہ گیا۔

"بھئی آخر میں تمہیں ڈی ایس پی کیوں نہیں لگتا؟"

پچھلے تین چار سال سے وہ سروس میں آیا تھا۔ مگر نعیم تھا کہ کسی طرح یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔

"اس لئے کہ تین سال بی اے میں فیل ہو جاتے تو ابھی بھی سوٹ تمہیں آنٹی و انکل پہننے کو دیتے۔ تب بھی تم یہی چیز لگتے۔ اور آج سے بہتر نوکر بلا سکتے تھے۔" وہ گلاس میں پانی ڈال کر منہ سے لگاتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

وہ اور نعیم خالہ زاد بھائی تھے۔ دونوں تقریباً ہم عمر بھی تھے۔ گہرے دوست بھی۔ اور کلاس فیلوز بھی رہ چکے تھے۔ مگر۔

بقول نعیم جیسے اُسے سکول سے پیار تھا۔ نکل آنے کو دل نہ کرتا تھا۔ سو اور سٹوڈنٹس سے ایک سال بعد میں ہی نکلا۔ پھر کالج سے اس قدر عشق ہو گیا کہ تین سال ایف اے لیے ہیں۔ اور بی اے دو سال کے بجائے تین سال میں کلیئر کیا۔ اور اب ایم اے میں بھی تیسرا سال تھا۔ دل اس کا ہنوز

اُن طلسماتی فضاؤں میں رہنے کو مچل رہا تھا ۔

پچھلے تین سال سے وہ یہاں کی یونیورسٹی میں ہوسٹل میں مقیم تھا ۔ دو بہنوں کا ایک ہی بھائی تھا ۔ باپ کا وسیع کاروبار تھا ۔ دھن دولت کی کمی نہ تھی ۔ عیش و عشرت میں وقت گزار رہا تھا ۔ پاس ہو کر نکلتا تو جانے عملی زندگی میں کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔

بس کتابوں پہ ہاتھ دھر کر آنکھیں بند کیے مگن تھا ۔ کامران کی چھوٹی بہن بچپن سے اُس کے نام تھی ۔ اس کا ماں باپ کو یقین کامل تھا ۔ کہ وہ پاس ہو گا ۔ اور وہ بھی اس کے سر پہ سہرا باندھ کر اپنے ارمان پورے کر سکیں گے ۔

بہنیں تو دونوں اپنے گھربار کی ہو چکی تھیں ۔ اکلوتا نعیم ابھی باقی تھا ۔ اور کتنی تمناؤں سے وہ اپنی بھابھی کو لانے کے خواب دیکھ رہی تھیں ۔

کامران کے والد پچھلے سال ہی چیف انجینئر ریٹائر ہوئے تھے ۔ آبائی جائیداد کی کوئی کمی نہ تھی ۔ اس لیے آج کل گھر پر ہی رہ کر پچھلے کئی سالوں کی تھکن اتار رہے تھے ۔

کامران بھی اکلوتا تھا ۔ دو بڑی بہنیں تھیں ۔ ان کی شادیاں ہو چکی تھیں بچوں والی تھیں اب ۔ ایک بہن چھوٹی تھی ۔ بی اے میں پڑھ رہی تھی ۔ اور نعیم کے پاس ہونے کی منتظر تھی ۔

کامران اور نعیم اکٹھے ہی ایچی سن کالج میں پڑھتے تھے جہاں نعیم کو

سکول اور کالج سے اتنا انس تھا کہ پاس ہونا چھوڑ دیا تھا۔ وہاں کامران ڈبل پروموشن کے علاوہ ہمیشہ ہر کلاس میں فرسٹ ڈویژن لیتا رہا۔

ایف ایس سی۔ کے بعد انجینئرنگ میں داخلہ لینا چاہا۔ مگر عمر ایک سال کم ہونے کی وجہ سے ایک سال انتظار کرنا پڑا۔ آرمی جوائن کرنے کا سوچا تو والد نے انکار کر دیا۔ سول ایس سی میں ایڈمیشن لے لیا۔ پھر ایم ایس سی کرنے کے بعد سی ایس پی کا امتحان دینا چاہا۔ یہاں بھی وہی ایک سال کی کم عمر آڑے آئی۔ بیکار بیٹھنے سے بہتر ایجوکیشن لینے امریکہ جانا بہتر سمجھا۔ دو سال وہاں گزارے۔ آتے ہی سی ایس پی کا امتحان دیا۔ اسے کلاس میں پاس ہوا۔ چند ماہ ٹریننگ لی۔ دو ڈھائی سال اسے سی رہا۔ کچھ عرصہ پنجاب میں رہا۔ آخری پوسٹنگ پشاور کی تھی۔ اور آج یہاں۔ پروموٹ ہو کر ڈی سی کا پہلی بار چارج لیا تھا۔

کامران کی عمر ستائیس سال سے چار یا پانچ ماہ اوپر تھی۔ اسی طرح نعیم بھی ستائیس سال کا پورا ہو چکا تھا۔

یہاں پہنچتے ہی وہ سیدھا نعیم کو لینے ہوسٹل گیا تھا۔ اور اسے ساتھ ہی لیتا آیا تھا۔ فی الحال عارضی طور پر۔ بعد میں مستقل اسے اپنے پاس رکھنے کا ارادہ تھا۔ کچھ ایک ہی سٹیشن پر اکٹھے رہ کر دونوں سے دور رہو رہا نہیں جا رہا تھا۔ کچھ نعیم بھی ہوسٹل کے کھانے کھا کھا کر اکتا سا گیا تھا

"تمھاری طرح"

"اور کیا! تم سے بہتر سوٹ میں نے ابھی ابھی تبدیل کیا ہے۔ تم سے زیادہ سمارٹ میں اب بھی لگ رہا ہوں۔

یہ اور بات ہے کہ کسی نے دفتر نہیں کہا۔ اب تک۔"

"بالکل بالکل۔ کل آتے وقت سمینہ بھی کہتی تھی۔ بھائی جان! آپ ٹھیک ہو گئے تو شاید" وہ "بھی اپنی آوارگی ختم کر کے پڑھنے میں دل لگا لیں۔"

اور نسیم کے فلک شگاف قہقہے گونج اٹھے۔ وہ بھی ہنسنے لگا۔

"کیسی رہی؟" قہقہے کچھ تھمے تو کامران نے پوچھا۔

"کچھ نہ کچھ تو ہی لوفر تو نہیں کہا"۔ وہ اب بھی ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔

"تو آوارہ اور لوفر میں فرق ہے؟"

"بالکل۔ ایک اردو اور دوسرا انگلش لفظ ہے۔"

"معنی تو ایک ہیں"۔

"منہ پر تو نہیں کہا"۔

"وہ دن بھی آ جائے گا"۔

"اور تمہارا آ بھی چکا۔ ویسے آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا؟ سنا ہے گھر بالکل پاس پاس ہیں۔ کسی دن سینڈل بھی ہوا میں تیرتی سر تک آ جاتے تو تعجب نہ ہو گا"۔

"وہ دن نہیں آئے گا"۔ کچھ سوچتے ہوئے وہ دل نشین انداز میں کہہ گیا۔

"تمھاری مسکراہٹ مجھے خطرے کا سگنل دکھا رہی ہے، کہیں دیکھ کر"۔
اس نے شرارت سے آنکھ دبائی "تو نہیں آ رہے ہو؟" ۔

"اوں ہونہہ۔ آواز سنی ہے فی الحال"۔

"اور آواز سے شکل کا اندازہ کیا جا سکتا ہے"۔

"پھر دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو وہ بدصورت ترین بدمزاج لڑکی ہوگی۔ اور یا پھر" وہ قدرے رکا۔ شرارت سے کنکھیوں سے اسے دیکھا۔ "کسی ملک کے تخت پہ بیٹھی ملکوتی حسن والی جابر ملکہ کی طرح"۔

"کام دونوں صورتوں میں نہیں بنے گا"۔ نعیم ہاتھ دھونے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا مطلب؟"۔ وہ بھی کرسی پرے کھسکا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"بدصورت ترین لڑکی ہوگی۔ تو میں تمھیں اس سے شادی کرنے نہیں دوں گا۔ اور حسین جابر ملکہ کی طرح ہوگی تو وہ تمھیں لفٹ نہیں دے گی"۔

وہ تولیے سے ہاتھ پونچھتا اطمینان سے بولا۔

چند لمحے کامران خاموشی سے ہاتھ دھوتا رہا۔ "اور اگر وہ اپنے املاک کے طلسماتی ماحول کی طرح کچھ کچھ سپیوں سے۔ کچھ بادامی سے۔ کچھ اس جھلکتی بل کھاتی ندی سے جو اس کے گھروں کے پاس بہتی ہے۔ کچھ ان نرم خرام ہواؤں سے ...." اس نے کوئی کھرا سا جواب نہ پا کر مڑ کر

دیکھا نعیم پاس ہی کھڑا دیوار سے ٹیک لگائے۔ آنکھیں موندے عجیب مضحکہ خیز شکل بنائے کھڑا تھا۔

"اور کچھ ان کالی کالی گھٹاؤں سے۔ کچھ رم جھم کی پھوار سے ملتی جلتی ہو۔ تو ؟" اس کے کان میں جاکر اس نے "تو" اتنے زور سے کہا۔ کہ وہ آنکھیں کھول کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

حنیدھے کا مراور اُسے سوالیہ نظروں سے دیکھتا رہا۔ " آؤ سو جائیں اب" کوئی جواب نہ پاکر وہ اُسے ہاتھ سے تھام کر بیڈ روم کی طرف لے چلا۔

"تمہاری بات کا جواب سوچ رہا ہوں" وہ سر کھجاتے ہوئے بولا۔

" بستر میں سوچ لینا" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

پھر دونوں ہی ضروری کاموں سے نمٹ کر نرم و گرم بستروں میں گھس گئے۔

"اب جواب دو" وہ کروٹ نعیم کی طرف لیتے ہوئے بولا۔

" ویسے مجھ سے الگ رہ کر بدمعاش کافی ہو گئے ہو"

اور کامران کھل کر ہنس دیا۔

" یہ میری بات کا جواب ہے ؟"

" بکے وقوف ہو" نعیم لحاف سر تک کھینچتے ہوئے بولا " چاہتے ہو ہوا ہی کے متعلق بولتا جاؤں میں۔ سب سمجھ رہا ہوں "

" لاجواب ہو گئے ہو نا" وہ بھی لحاف کندھوں تک لیتے ہوئے

سیدھا لیٹ گیا۔

"خیر کی بہو بیٹی کے متعلق ایسا سوچنا کہاں کی شرافت ہے؟"
نعیم ہاتھ بڑھا کر لیمپ آف کرتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

اور کامران مزید ہنس دیا۔

"وہ کسی کی بہو نہیں ہے"

"بیٹی تو ہے"۔

"دیکھا جائیگا"۔ وہ اب بھی ہنس رہا تھا۔

"جیسی بھی لوفروں والی ہے" وہ بڑبڑایا۔

"آج لوفر کی گردان کیوں کئے جا رہے ہو؟ تم صرف مجھے اتنا بتا دو کیوں [illegible] بات پر [illegible] رہا تھا"

"جو بھی لوفر"۔ وہ اطمینان سے کہتا گویا سو ہی گیا۔

"میں بھی سمجھ لوں گا اسے"۔ وہ جیسے خود سے بولا۔

"کیسے؟" نعیم نے یکدم ہی سر لحاف سے باہر نکال لیا۔

"ایسے"۔ وہ بھی ہنستے ہوئے اسی انداز میں بولا۔

"اس لڑکی کو؟"۔ وہ قدرے حیرت سے پوچھنے لگا۔

"ہاں اسی لڑکی کو"۔ اس نے اطمینان سے کہا۔

اور کروٹ دوسری طرف پھیر لی۔

آج اُسے یہاں شفٹ ہوئے دوسرا دن تھا۔ ساتھ ہی وہ نعیم کا بھی بوریا بستر ہوسٹل سے اٹھوا لایا تھا۔ اب وہ یہیں سے یونیورسٹی جایا آیا کرتا تھا۔ اور کامران خوش تھا بہت۔ اُسے اچھا ساتھ ملا تھا۔ قدردان لوگ ملے تھے۔ سحر آفریں ماحول ملا تھا۔ جو سب سے بڑھ کر نعیم کی سنگت میسر آئی تھی۔ اور عرصہ بعد اُن کے جتنے اکٹھے گزرنے تھے۔

کوٹھی میں سات بیڈروم تھے۔ ہر ایک کے ساتھ ڈریسنگ روم اور اٹیچڈ باتھ روم تھے۔ ہر بیڈروم بہت کشادہ تھا۔ ہر ایک میں بیش قیمت قالین بچھے ہوئے تھے۔ ہر کمرہ قدیم طرز کے نایاب فرنیچر سے آراستہ تھا۔ ہر کھڑکی اور دروازے پر قیمتی اور بھاری پردے آویزاں تھے۔ بہت قیمتی اور بھاری طرز کی مسہریاں نرم و گرم سے ڈھکی موجود تھیں۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر لیمپ رکھا ہوا تھا۔ ہر ڈریسنگ روم میں قدیم طرز کی چوڑے اور قد آدم شیشے والی ڈریسنگ ٹیبل موجود تھی۔ بڑے بڑے وارڈ روب تھے۔ اور باتھ رومز میں بھی ہر قسم کی آسائش مہیا تھی۔

اس کا بیڈروم بھی باقی بیڈرومز کی طرح کشادہ تھا۔ مگر قدرے الگ تھلگ

اور رُخ اندرونی چمن کی طرف تھا۔ فرش پر بچھا قالین بے حد قیمتی اور گداز تھا
کھڑکیوں اور دروازوں پر لگے پردے بھاری اور بے حد قیمتی تھے۔

دوسرے بیڈ روم کے برعکس اس بیڈ روم کا سارا فرنیچر جدید ترین فیشن
کا تھا۔ جیسی چوڑی کھڑکی کے پاس ہی اس کا چوڑا خوبصورت اور نرم فوم کا بیڈ تھا۔
بستر پر سفید چادر بچھی تھی۔ پروں والے سفید نرم نرم تکیے تھے۔ اور بہت ہی نرم اور
گرم دو کمبل تھے۔ کمبلوں کے نیچے سفید چادر لگی تھی۔ اور پورا بستر بہت ہی قیمتی
بیڈ کور سے ڈھکا ہوا تھا۔ دونوں طرف بہت نفیس بیڈ سائیڈ ٹیبل تھے۔
جن میں سے ایک پر اس کا قیمتی ٹرانسسٹر سیٹ ولیمپ اور دوسرے پر ٹیلیفون
رکھا ہوا تھا۔

بیڈ والی کھڑکی سے سبزے کے باغ کا کچھ منظر اور کچھ جدید کوٹھی کا ایریشن
نظر آتا تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں چوڑی سی رائٹنگ ٹیبل اور اس کے
آگے گھومنے والی کرسی رکھی تھی۔

دوسری سمت کھڑکی کے پاس قیمتی فوم کا لمبا چوڑا صوفہ سیٹ اور اس کے
آگے میز رکھی ہوئی تھی۔

ڈریسنگ روم میں جدید طرز کی قیمتی مردانہ ڈریسنگ ٹیبل تھی۔ بڑا سا
وارڈ روب تھا۔ کھڑکی یہاں بھی چوڑی تھی۔ اور جدید کوٹھی کے بالکل سامنے
کھلتی تھی۔

باتھ روم میں دورِ جدید کی ہر سہولت مہیا کی گئی تھی ۔ باتھ روم کا بیرونی دروازہ اندرونی نیم تاریک برآمدے میں جدید کوٹھی کی طرف کھلتا تھا۔

ڈرائنگ روم ایک بڑے ہال سے مشابہ تھا جس میں چاروں طرف دیوار کی لمبائیوں کے ساتھ قیمتی قسم کے صوفے لگے ہوئے تھے ۔ درمیان میں میزیں تھیں قیمتی بھاری پردے کھڑکیوں اور دروازوں پہ لگے ہوئے تھے۔ ڈرائنگ روم کا ایک دروازہ کوریڈور میں دوسرا بیرونی نیم تاریک برآمدے میں اور تیسرا کھانے کمرے میں کھلتا تھا۔

کھانے کا کمرہ بھی ہال نما تھا ۔ اس کے بیچوں بیچ تقریباً پوری لمبائی تک میز تھی ۔ اردگرد کوئی ڈیڑھ درجن کرسیاں میز اور کرسیاں بہت قیمتی لکڑی کی اور قدیم آرٹ کا مکمل نمونہ نظر آرہی تھیں ۔

شیشے کی الماریوں میں خوبصورت اور قیمتی ٹی سیٹ اور دیگر دیدہ زیب برتن سجے نظر آرہے تھے ۔ کھانے کمرے کا ایک دروازہ کوریڈور میں ایک ڈرائنگ روم میں اور تیسرا کچن کی طرف کھلتا تھا۔

کوٹھی اس کے لئے بہت بڑی اور وہ بالکل تنہا تھا ۔ اچھا تھا نعیم بھی ادھر شفٹ ہو گیا تھا ۔ ورنہ پوری زندگی بیتے بیتے ۔ " پونے چار ہوئے ہیں اور ٹھیک چار بجے تم نے کہا تھا چائے پہ پہنچنا ہے " نعیم اس کے بیڈ روم میں آتے ہوئے بلا تمہید بولا ۔

"یار تھک گیا ہوں باہر سے کھا کر" وہ تھکا تھکا سا بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

واقعی جب سے آیا تھا، دونوں وقت کا کھانا اور چائے باہر ہی ہوتے تھے۔ کبھی کوئی انوائیٹ کر لیتا تھا تو کبھی کوئی۔ کبھی سرکاری لوگ اور کبھی سرکاری لوگ اور کبھی غیر سرکاری۔

"رات کا کھانا تو گھر پہ ہی آ رہا ہے۔ باہر نہیں جانا پڑے گا" نعیم نے اس کا رخ ڈرائنگ روم کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

رات کا کھانا نعیم احمد کے گھر سے آ رہا تھا۔ نعیم احمد موجود ہوتے تھے تو نہایت بے تکلف طریق پر ڈی سی کو اپنے یہاں بلا یا کرتے تھے۔ کبھی خود موجود نہ ہوتے۔ تو اسی طرح ہوتا۔ کھانا ان کے گھر سے ضرور پہنچتا۔

"تم ہی کھانا دو نا" وہ ڈرائنگ روم سے بولا۔

"تمہاری تو اُن دیکھی دشمنی ہے"۔

"اَن دیکھی نہیں۔ دیکھی دشمنی ہے" کپڑے بدلتے بدلتے اس نے جواب دیا۔

"وہ کیسے؟"

"اس کا سایہ دیکھا تھا پردے برابر کرتے ہوئے"۔

"خاصے نظر باز ہو"۔

"تم سے کم ہوں"۔

میں نے کیا کیا ہے؟" -

"لگتا ہے تو رشتہ ہونا"۔

"بدمعاش" نعیم ہنستے ہوئے بولا۔

"ویسے..." وہ کپڑے بدلتے بدلتے دروازے سے جھانکنے لگا۔ "بول چاہے تو تم بھی کرو۔ کتنی ٹھنڈی ہے۔"

"مروا نہ دینا کہیں" نعیم نے گویا سہم کر کہا۔

"اسے پتہ بھی نہیں چلے گا" کامران نے بھی پوری رازداری سے کہا۔

"تمہاری بہن بے سائے سے بھی دشمنی کرتی ہے۔ سوچ لو" نعیم نے ہاتھ میں پکڑا رسالہ میز پر پھینکتے ہوئے کہا۔

اور کامران زور زور سے ہنستا ڈریسنگ روم سے باہر نکل آیا۔

"چلو" انس نے نعیم سے کہا۔

"چلو" نعیم بھی انس کے پیچھے ہو لیا۔

۴

آج وہ کوئی تین بجے تک آفس میں رہا تھا۔ کبھی فائلیں چیک کرنی تھیں کبھی دستخط کرنے تھے۔ کبھی فارمز دیکھنے تھے۔ کبھی اپیلیں چیک کرنی تھیں۔ اور

سنی دیدہ داستانوں پر غور کرتا تھا ۔

پھر آخر میں دو دو بار علاقے کے چند معتبر آدمی اپنے علاقے سے متعلق اپنی پُرخطر مشکلات بتانے آ گئے تھے ۔ اور یوں رات اٹھتے اٹھتے تین بج گئے ۔

آج پہلی بار وہ گھر میں کھانا کھانے آ رہا تھا ۔ تھکا تھکا یا سا وہ ڈاک گزار کوٹھی میں آیا ۔ نعیم کھانا کھا کر آرام کرنے لگا تھا شاید ۔ اس نے اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا ۔ آہستہ قدم کوریڈور میں سے گزرتا اپنے ڈریسنگ روم میں گیا ۔ کپڑے تبدیل کیے ۔ ہاتھ منہ دھوئے ۔ قدرے تازہ دم ہوا ۔ واپس باہر نکلا ۔ اور آہستگی سے کھانے کے کمرے میں چلا آیا ۔

میز پر لگا گرم گرم کھانا دیکھ کر اس کی بھوک چمک اٹھی ۔ کرسی کھینچ کر وہ بیٹھ گیا ۔ پلیٹ میں چاول نکالتے نکالتے وہ خود بخود ہی مسکرا دیا ۔ نعیم کھانے پر کبھی کسی کا انتظار نہیں کرتا تھا ۔ جبھی تو اس عمر میں بھی وہ پہلوان لگتا تھا ۔ کھانے کے بعد وہ سیب چھیلنے لگا ۔ اب اس کے ہاتھ آہستہ آہستہ چل رہے تھے ۔ وہ سوچوں میں گم تھا ۔ ہونٹوں پر دلنشین مسکراہٹ بکھری تھی ۔ اور آنکھیں کسی شوخ خیال سے شوخ ہوتی جا رہی تھیں ۔

وہیں بیسن میں ہاتھ دھو کر تولیے سے پونچھتا وہ واپس اپنے کمرے میں آ گیا ۔ تھکا ہوا تو تھا ہی بستر پر پڑتے ہی سو گیا ۔ پھر آنکھ کھلی تو پانچ بج رہے تھے ۔ چند لمحے وہ کسلمندی سے بستر میں پڑا رہا ۔ پھر اٹھ کر منہ دھویا ۔ کپڑے

آخری جھکورے پر سیڑھیاں اُتر گیا۔

چائے پیتے ہوئے بھی اس کی نظریں سُرمئی بادلوں پر سُرخی مائل سنہری دھبوں پر اور پہاڑی کے پیچھے چھپتے سورج پر جمی ہوئی تھیں۔

چائے کے دوسرے کپ میں چینی ملاتے ملاتے وہ یکبارگی چونکا۔ دائیں طرف سامنے ہی سبزیوں کی کھیتیوں کے آخری کنارے جدید کوٹھی کے ٹیرس پر سے ایک ہلکا سا چھوٹا سا قہقہہ اُبھرا تھا۔ جیسے پریوں کے دیس کی گھنٹیاں بج اُٹھی ہوں۔ بادلوں میں پوشیدہ نرم و نازک پروں والی گھنٹیاں۔ وہ اُدھر ہی دیکھنے لگا۔ آہنی خوشنما لوہے کی سفید تاروں والی کرسیوں میں سے ایک پر وہی اُس شام والی بھاری بھرکم گورنس نما عورت۔ اس طرف پیٹھ کئے، پیچھے بہتی ندی کی طرف رُخ کئے بیٹھی تھی۔ جبکہ۔

سبز دھنستی گلابی گلابی سی ایک بے حد نازک سی لڑکی اس کی طرف رُخ کئے بالکل سامنے ہی بیٹھی تھی۔

کامران کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ یہ یقیناً مس صبیحہ احمد تھی۔ راستے دنوں میں وہ آج پہلی بار اُسے دیکھ رہا تھا۔ اور بھاری جسم والی عورت۔ وہ بھی یقیناً اس کی گورنس وغیرہ تھی۔

اُس نے جلدی جلدی چائے ختم کی۔ خالی کپ میز پر رکھا اور آہستہ سے کرسی پیچھے کھسکاتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

برآمدے کے آخری کونے کی سیڑھیاں اتر کر وہ لان کے کنارے
چھوٹی سی جھاڑیوں سے ذرا ہٹ کر آ گیا - اب وہ ان کے ٹیرس سے صرف چند گز
کے فاصلے پر تھا - ایک لمحہ کو وہ جھجک سا گیا - ٹیرس کے اتنے قریب جانا
اُسے بےجا مداخلت معلوم ہوا -

لیکن مہرو آپی کی خوبصورت آنکھوں میں شوخی اتر آئی - لب شرارت
سے پھڑپھڑا اُٹھے - اور قدم - وہ بے ساختہ آہستہ آہستہ ٹیرس کے قریب تر ہوتے گئے
"السلام علیکم" وہاں پہنچتے ہی اس نے بھاری جسم والی عورت کو نہایت
معصومیت سے مخاطب کیا -

"جیتے رہو بیٹے" گورنس نظروں کا چشمہ اس پر فکس کرتے ہوئے جیسے
اس تخاطب سے کھل ہی تو اُٹھیں -

"مزاج کیسے ہیں؟" وہ ایک اُچٹتی نظر کا بچہ ایسے ادھر والی مس بنفشہ احمد
پر ڈالتے ہوئے بولے -

"اللہ کا فضل ہے - تم سناؤ بیٹے - دل لگ گیا یہاں" - وہ باتیں کرنے
والی سلائیاں قریبی میز پر رکھتے ہوئے گویا مکمل طور پر اس کی طرف متوجہ ہو گئیں
"جی جی دل - جی بالکل لگ گیا" مس بنفشہ احمد کی آنکھوں میں دلیری سے
جھانکتے ہوئے وہ گورنس کی نظریں صاف بچا گیا -
اور مس بنفشہ بری طرح پہلو بدلنے لگی -

"ڈی سی صاحب کے فرزند ہوں گے آپ؟" گورنس نے فصیح احمد
کی طرف توجہ دیئے بغیر یہ سلسلہ جوڑا۔ وہ شہر سے بس اتنا ہی تو لگتا تھا۔

"جی!" — وہ چکرا سا گیا۔ ایک نظر میں فصیح احمد پر ڈالی۔ وہ ابھی
حیرت زدہ ہی تھی۔ "جی ہاں، صحیح پہچانا۔ آپ نے۔"

"ماشاء اللہ۔ ماشاء اللہ۔" اب کے گورنس نے خلیق کا زاویہ پھیر بدلا۔
سر سے لے کر پاؤں تک اُسے گھورا۔

لمبا قد، چوڑے شانے، وجیہہ شکل و صورت، ملاحت بھرہ وہ مردانہ
وجاہت کا شاہکار تھا۔

"نام کیا ہے بیٹے؟"

"جی۔ وہ۔ نعیم..."

"پڑھتے ہو گے؟ یا پڑھ چکے ہو؟" گورنس کو پاس بیٹھی لڑکی کی کوفت کا
کوئی اندازہ نہ تھا۔ وہ تو گویا سی اُس کا پورا انٹرویو لینے پر تُلی نظر آ رہی تھیں اور
کامران —

اُس کا تو گویا دلی مقصد حل ہو رہا تھا۔

ایک پل کو سوچ میں پڑ گیا۔

"جی پڑھ رہا ہوں ابھی" — وہ مزید معصومیت سے بولا۔

"کون سی کلاس میں پڑھتے ہو؟"

"جی ہاں۔ ایسے ہیں" ۔ وہ انکسار سے بولا۔

"ہاں۔ ایسے ہیں؟" ۔ وہ شاید ٹھیک سے سن نہ پائی تھیں۔

"جی۔ دراصل۔۔" اس نے پھر ایک نظر لڑکی کی متحیر سی آنکھوں میں دیکھا۔

"میں فیل ہو گیا تھا" وہ سبزی کے گرد لگی باڑ کی پتیاں نوچتے ہوئے بولا۔ "ملک سے باہر پڑھنے کے لئے گیا تھا۔ واپس آیا۔ امتحان میں دن تھوڑے تھے۔ بس فیل ہو گیا۔" گریس کی نظر میں بچا کر بنیسے احمد کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی سست چاہت سے دل ہی دل میں محظوظ ہوتا وہ جاتا گیا۔

"کوئی بات نہیں بیٹے اس دفعہ پاس ہو جاؤ گے۔ ہمت نہیں ہارنا چاہیے۔"

"جی بجا فرمایا۔ ہمت نہیں ہارنا چاہیے۔" وہ مزید انکسار سے بولا۔

"کتنے بہن بھائی ہو بیٹے؟"

"دو بہنیں بڑی ہیں۔ ایک مجھ سے چھوٹی ہے۔۔۔"

"گھر بار والی ہوں گی؟"

"جی دو کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ اور۔۔۔"

"اور تم۔۔۔؟" جانے وہ کیا پوچھنا چاہتی تھیں!

"جی۔ میں ابھی غیر شادی شدہ ہوں۔" اس نے عجیب سی نظروں سے لڑکی کی آنکھوں میں دیکھا۔

ایسا نازک سرسری جسم، گلابی شفاف رنگت، شربتی آنکھیں، لمبے سنہری بال
لمبے دود خوبصورت نقوش - اور غضب کا متناسب جسم تھا۔

اٹھارہ، انیس عمر ہوگی - مگر چہرے پر اس قدر معصومیت تھی کہ مشکل
سے پندرہ سولہ سال کی لگتی تھی۔ اس قدر نازک تھی۔ اس قدر شفاف کہ اُسے
دیکھتے ہی جانے کیوں؟

اچانک ہی اس کے ذہن میں آیا تھا - وہ اُسے دو انگلیوں میں اٹھا سکتا
تھا مگر -

ساختہ ہی یہ بھی کہ ہاتھ لگنے سے واقعی اس کے میلے ہو جانے کا امکان تھا۔
ٹیلیویژن پر اس کے غیض و غضب کے برعکس اس کی نظریں کبھی حیا سے
جھک جاتیں۔ کبھی ناراض سی نظر آنے لگتیں۔ پھر کبھی سہمی سی اور کبھی شاید
مشتعل سی لگنے لگتی تھیں۔

وہ واقعی اس کے خیال کی طرح تھی۔ ایک مفروضہ خیال - جو حقیقت کا
روپ دھار گیا تھا۔

دور پانیوں پر نظریں جمائے وہ اسی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اور پھر
اچانک ہی۔

وہ زور سے ہنس دیا۔ پھر ہنستا ہی چلا گیا۔ ابھی ابھی تھوڑی دیر قبل اس
نے کیسی زبردست ایکٹنگ کی تھی؟ -

کیسی ووٹ ٹیانگ یانگ کرآیا تھا۔ اور کیسے وہ اُسے پیچ پچ کا لوفر سمجھ کر اُٹھ کر اندر چل دی تھی۔

اُس نے بھی تو حد کر دی تھی۔ جب بھی اُس کی طرف دیکھا تھا۔ خالص غنڈوں والی نظروں سے دیکھا تھا۔

"آپکا نام لوفر ہے مجھے اچھی طرح معلوم ہے" اُس کے آواز کی بازگشت اُس کے کانوں میں آئی۔

"بہت اچھا کیا تھا اُس نے بھی"۔ وہ اپنے کیے پر ذرا بھی پشیمان ہوئے بغیر واپس اوپر آ گیا۔ پھر اب اُسکے سن روم کی طرف بادام کے باغ کے ساتھ چلتا کچن کے آگے سے گزرتا وہ بائیں طرف سلیٹ نما پتھروں والی سیڑھیوں پر اوپر چڑھنے لگا۔

آخری ٹیرس پر پہنچ کر وہ سنگ مرمر کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہاں سے وہ تمام اطراف دیکھ سکتا تھا۔ وہ بل کھاتی سڑک بھی جس پر ابھی نعیم نے واپس آنا تھا۔ اور وہ

شدت سے نعیم کا منتظر تھا۔ آج کی اپنی آوارہ گردی بلکہ بقول کسی کے اپنی "لوفری" کی اُسے رپورٹ دینا تھی۔ اپنے انٹرویو کا حال سنانا تھا۔ جس کے لئے اُس نے کوئی تیاری نہیں کی تھی۔ اور جس میں پھر بھی کامیابی کی منزل اُسے سامنے نظر آ رہی تھی۔

"ڈی ایس پی صاحب کے فرزند ہوں گے آپ؟" اُسے اچانک یاد آیا۔ اور پھر قریبی میز پر سرٹیک کر وہ بے اختیار ہنس دیا۔ گرنس نے اُس کی سوچ کو ایک نئی راہ دکھائی تھی۔

"مجھے یہ آدمی اچھا نہیں لگا ماما؟" کمرے کی کھڑکی میں سے اُسے الیس اندر کی طرف جاتے دیکھ کر وہ واپس ٹیرس پر آ کر اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"ہائیں بیٹی"۔ ماما کے تیزی سے سلائیاں چلتے ہاتھ رک گئے۔ "وہ تو بہت ہی نیک لڑکا لگتا ہے۔ مجھ غریب کو دیکھو کیسی عزت سے مخاطب کرتا تھا۔"

ماما کو تو جیسے اُس کی باتوں نے خرید ہی لیا تھا۔

"کچھ بھی ہو۔۔۔" وہ جزبز سی ہو کر رہ گئی۔

کچھ دیر قبل کی اُس کی بے باک نظریں اُسے یاد آ گئیں۔

"آپ اُسے زیادہ منہ مت لگایا کریں۔"

"تو بیٹیا۔ اب یہاں تک آ ہی گیا تھا۔ تو میں کیا کرتی۔ پھر اُس نے کوئی ایسی بُری حرکت بھی نہیں کی۔"

"اتنا قریب آنے کی کیا ضرورت تھی؟" وہ بڑبڑائی۔

"اُس کے اپنے گھر کے حدود میں بیٹی ۔ ہم اُسے منع تھوڑی کر سکتے ہیں ۔ پھر کوئی ایسا ویسا تو ہے نہیں ۔ بڑے باپ کا بیٹا ہے ۔ اچھے گھرانے کی اولاد ہے ۔"

"اچھے گھرانے کی اولاد اس طرح ہوتی ہے ۔ ؟ میرا مطلب ہے ۔" اس نے فوراً ہی بات بدلی ۔ اُس کی بے باک نظروں کا ماما کو کیونکر کہتی ۔ "امتحان میں دن تھوڑے سے تھے ۔ تو باہر جانے کی کیا ضرورت تھی ؟ یہی ٹھاٹھ باٹھ ہیں ۔ جبھی تو فیل ہوتا رہا ہے ۔ اور پھر کتنی ڈھٹائی سے بتا بھی رہا تھا ۔"

"میں تو کہتی ہوں بیٹی احسان گری سے بہتر کوئی چیز نہیں کتنی سچائی سے ہر بات بتا رہا تھا ۔ کوئی بناوٹ نہیں تھی ۔ اُس کی باتوں میں ۔"

"آپ تو ہر ایک کو اچھا سمجھ لیتی ہیں ۔" وہ پھر دھیرے سے بڑبڑائی ۔

وہ ماما کی عادت سمجھتی تھی جس کو ایک دفعہ اچھا سمجھ لیا بس سمجھ لیا ۔

"نہیں بیٹی انہیں ایسا نہیں سوچنا چاہیے ۔ وہ یقیناً شریف لڑکا ہے ۔"

"بابا جان نے خواہ مخواہ ہی پروگرام اتنا لمبا کر لیا ہے ۔ بیچ میں ہفتہ بھر کے لئے میکر لگا جانے تو اچھا تھا ۔" اُس نے بات کا موضوع یکسر ہی بدل دیا ۔

"شاید ایسا ممکن نہ ہو ۔" ماما بولیں ۔

"اس بار مجھے شدت سے انکا انتظار تھا ۔" وہ کچھ اُداس سی بولی ۔

اُسے ہمیشہ ہی بابا جان کا شدت سے انتظار رہتا تھا ۔ ممی کا وہ چھوٹی سی تھی تو انتقال ہو گیا تھا ۔ تب سے انہیں ہی اُسے سینے سے لگائے ہوئے تھے ۔ ماما

ممی کی زندگی میں بھی اس کی دیکھ بھال کیا کرتی تھیں۔ بعد میں تو اسے حقیقی اولاد سمجھ کر پالا۔ خود بچاری بیوہ بے اولاد تھیں۔ اس کو ہی اپنی کل کائنات سمجھ لیا تھا۔

وہ چھوٹی تھی۔ تو بابا جان اسے بیرونِ ملک بھی ساتھ ساتھ لئے پھرتے تھے۔ پرائمری تعلیم بھی وہیں دلوائی۔ مگر دس سال کی ہوئی تو باہر کا ماحول انہیں اس کے لئے مناسب نہ لگا۔ ہر چند کہ وہ بے جا پابندیوں کے قائل نہ تھے۔ مگر اپنے مشرقی اقدار انہیں بہر حال عزیز تھے۔ اور یہی اقدار اپنانے اور قائم رکھنے کے لئے انہوں نے اسے وطن میں ہی گورنس کی حفاظت میں دے دیا۔
خود کبھی یہاں کبھی وہاں۔ مختلف ممالک میں اپنے وسیع کاروبار کے سلسلے میں جاتے رہتے۔ اس کی چھٹیوں کے لئے البتہ ان کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی کہ ملک میں رہیں۔ اور یوں تین ماہ کی چھٹیاں باپ بیٹی اپنے آبائی گاؤں میں گزارنے چلے جاتے۔ وہ اپنی جائیداد کی جانچ پڑتال کرتے۔ اور وہ گاؤں کے ماحول سے لطف اٹھاتی۔

وقت گزرتا رہا۔ وہ سکول سے کالج میں آگئی۔ اور اب وہ بی اے کے آخری سال میں تھی۔ ہفتہ دو بعد سالانہ امتحان ہونے والے تھے۔ پھر وہ فارغ ہی فارغ تھی۔ ہمیشہ کی طرح اسے اس بار بھی گاؤں جانے کی جلدی تھی۔ سردی کی چھٹیاں وہ وہیں بابا جان کے ساتھ گزارا کرتی تھی۔ وہاں کا موسم یہاں

سے اچھا تھا۔ ٹھنڈ وہاں بھی خاصی ہوتی تھی۔ مگر یوں منجمد کرنے والی نہیں تھی۔

چند دن قبل وہ بے حد خوش تھی۔ بابا جان اپنے پروگرام کے مطابق پرسوں
سے پہنچنے والے تھے۔ مگر پھر آنے کی بجائے انہوں نے اچانک ہی فون پہ
اُسے بتایا کہ وہ تین ماہ مزید نہ آسکیں گے۔ وہ بے طرح اداس ہو گئی تھی۔
پھر ماما اُسے اُس کی دوست صوفیہ کے یہاں لے گئی تھیں۔ پکچر دکھا لائی تھیں
ہر طرح سے مصروف رکھا تھا۔ اور پھر وہ بھی بہل ہی گئی تھی۔

"آجائیں گے بیٹی تم دل تھوڑا کیوں کرتی ہو۔ تین مہینے یوں چٹکی بجاتے
میں گزر جائیں گے"۔ وہ واقعی چٹکی بجاتے ہوئے بولیں۔

اور وہ خوبصورتی سے مسکرا دی۔ ماما اس کا کتنا خیال رکھتی تھیں۔

"ماما میرا یونیفارم آگیا ہے دھوبی کے یہاں سے؟"۔ اُسے اچانک
ہی خیال آیا۔ آج اسکی چھٹی تھی۔ سارا دن یاد ہی نہیں رہا تھا۔

"ہاں صبح ہی دھوبی کپڑے لایا تھا۔ میں نے تمہارے وارڈروب میں
ہینگر میں ڈال دیئے ہیں"۔

"شکریہ ماما۔ بوٹ بھی پالش ہو گئے ہیں؟"۔ اس نے مزید پوچھا۔

"وہ بھی تمہارے شو ریک میں رکھے ہیں"۔

"شکریہ" وہ پھر بولی۔ اور

تب وہ یکبارگی زور زور کے مردانہ قہقہوں سے چونک اٹھی

"جوانی بے فکری ہوتی ہے۔" ماما لہجے میں شفقت لئے پیچھے مڑ کر قدیم کرسی کے سامنے والے بیڈروم سے آتے قہقہوں کی سمت دیکھتے ہوئے زیر لب بولیں۔ "بچے ہی ہیں ہنسنے کھیلنے کے دن ہیں۔" وہ واپس رخ پھیر کر سلائیاں بننے لگیں۔

"خاک بچے ہیں۔" وہ جانے کیوں؟ ماما کی بے جا طرفداری برداشت نہ کر سکی۔ "چھ فٹ کا قد اور ابھی بچہ ہے۔" وہ بڑبڑائی۔

اسے سیڑھیوں کے قریب آتے دیکھ کر اس کے قد اور شخصیت سے وہ اتنی مرعوب ہوئی تھی۔ اس نے اس کی آنکھوں میں دلیری سے دیکھا تھا تو وہ کچھ مبہم سی ہو گئی تھی۔ مگر پھر وہ شادی کا ذکر کرنے لگا تھا۔ تو کیسی بے باک نظروں سے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ اسے پھر اسکی بے باک نگاہیں یاد آگئیں۔

"قد سے کیا ہوتا ہے بیٹی۔ یہ عمر ہوتی ہی ایسی ہے۔"

"اچھا ماما۔ آپ کہتی ہیں تو ہوتا ہوگا۔" اسے ماما کی ممتا کے آگے سپر ڈالنے ہی پڑتے۔ وہ سمجھ گئی تھی۔ وہ ماما کو کم از کم اس آدمی کے بارے میں قائل نہ کر سکے گی۔ "میں تھوڑا ہوم ورک کر لوں گی۔ صوفیہ سے فون پہ بات بھی کرنی ہے۔" وہ کرسی پرے کھسکاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

اور ماما کامران اور نعیم کے جاندار قہقہے سن سن کر ممتا نچھاور کرتی رہیں۔

تین سو میل لمبا اور کچی سڑک والا راستہ طے کر کے اس کی جیپ کوٹھی کے اندر داخل ہوئی۔ آج پورے چار دن کے دورے کے بعد وہ گھر پہنچا تھا۔ تمام کپڑوں اور بالوں پر دھول جمی ہوئی تھی۔ تھکا تھکایا سا وہ سیدھا اپنے کمرے کی طرف گیا۔

"ہیلو کامران" نعیم نے اسے کوریڈور میں آلیا۔ "سناؤ کیسی رہی ٹرپ؟"

"کچھ نہ پوچھو۔ جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے۔ ایک تو راستہ۔ راستہ تو شاید وہ نہیں تھا۔ جیپ خود ہی بیچاری راستہ بناتی آرہی تھی۔ اوپر سے جیپ کی سواری"۔ وہ ہاتھ میں پکڑا بریف کیس اور پستول الماری میں رکھتے ہوئے بولا۔

"تمہارا قصور نہیں ہے۔ تم کچی سڑکوں کے عادی ہو۔۔۔۔"

"ہو بہت ہوشیار۔ صاف کنی کترا گئے"۔ وہ ہنستے ہوئے باتھ روم کی طرف بڑھا۔

"میں نے تو صاف کہہ دیا تھا۔ ایسی غیر رومانٹک جگہ جانا اپنے بس کا روگ نہیں ہے"۔

"نہا کر آتا ہوں۔ پھر باتیں ہوں گی"۔ وہ ڈریسنگ روم سے ہوتا باتھ روم

میں گھس گیا۔

گرما گرم پانی کا شاور لیا۔ تو طبیعت خوش ہو گئی۔ بڑا سا تولیہ لپیٹ کر وہ ڈریسنگ روم میں آیا۔ گرم ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے۔ نرم اون کی گرم پل اوور پہنی۔ گرم جرابیں پہن کر چپل پہنے۔ تولیے سے سر اچھی طرح رگڑا۔ اور کمرے میں آ گیا۔

نعیم پہلے سے اس کے بستر میں گھسا منتظر بیٹھا تھا۔ مسکراتے ہوئے کامران بھی پاؤں کی طرف سے گھس گیا۔

تبھی دروازے پر دستک ہوئی اور اجازت پانے ہی بیرا چائے کی ٹرے اندر لے آیا۔ میز بستر کے قریب لاتے ہوئے بیرے نے وہیں برتن رکھ دیئے اور خالی ٹرے لے کر واپس چلا گیا۔ "تقریباً پچاس میل پرے سے میرا دل شدت سے چاہتا تھا۔ کوئی کا ایک گرم گرم کپ مل جائے۔"

"دیکھو کامران! میں نے تمہیں پہلے بھی کہا ہے۔ یہاں کوئی ۔کوکو کا ذکر مت کیا کرو۔ یہ پہاڑی لوگ ہیں۔ یہ نازک نازک چیزیں نہیں جانتے۔" نعیم پیالیوں میں چائے انڈیلتے ہوئے حسب عادت گویا ہوا۔

"میں آج ہی ساری چیزیں منگوا لوں گا۔ اور پھر خود بنایا کروں گا۔ دوسرے کے ہاتھ کی بنی بھی کوئی کوئی ہوتی ہے؟"

"کیوں نہیں ہوتی۔ سمینہ بڑی زوردار کوئی بناتی ہے۔" وہ ڈھٹائی سے بولا "آپ بھی میں نے سکھائی ہے۔"

"اسی لئے گھونٹ بھرتے ہی معدہ کا ذائقہ کڑوا ہو جاتا ہے۔"

اور کامران ڈھیر سے ہنس دیا۔

"میرا دل چاہتا ہے۔ Cheese pie بناؤں۔ ڈھیر ساری چوکلیٹ بناؤں۔ سینڈوچز بناؤں اور مختلف قسم کے سلاد..."

"یہ ارمان یہاں تو پورے ہونے سے رہے۔"

"نہیں۔ خود کبھی کبھی ضرور کچھ پکایا کریں گے۔ کبھی کبھی کک کی چھٹی کروا دیا کریں گے۔ ورنہ پھر تو۔ عجیب اجنبی سا ماحول لگا کرے گا۔ یہ کیا کہ اپنے کچن کے اندر بھی نہ جا سکو۔ اپنی مرضی سے کچھ کر ہی نہ سکو۔"

"مجھے تو معاف ہی رکھو۔ سوائے ہوسٹل میں سوجی کے حلوے کے اور میں نے کچھ نہیں سیکھا۔ ہاں انڈے بھی بنانا جانتا ہوں۔" پھر جیسے اُسے یاد آیا "یاد ہیں؟ امریکہ میں وہ گرل فرینڈ کچھ نہیں بنا کر دیتی تھی؟ سب خود کرتے تھے؟"

"میری کون سی گرل فرینڈ تھی وہاں؟" نعیم کی اچانک ہی ٹیڑھی بدلنے والی بات پر وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"میرے پاس تمہارے کئی خط موجود ہیں جن میں تم نے اُس کا ذکر کیا ہے۔"

"ہاں تھی تو۔ ایک نہیں... دو تین تھیں... مگر..." وہ کچھ سوچتے سوچتے مسکرا دیا۔ "پر تمہاری پڑوسن کا کیا حال ہے...؟" اس کا اشارہ مس فہیمہ احمد کی طرف تھا۔

"پڑوسن میری یا تمہاری؟" نعیم اس کی طرف ملتفت ہو کر بولا۔

"دونوں کی۔ یار ... چائے گرجائے گی"۔ اس نے جلدی سے کپ میز پہ رکھ دیا۔

"صرف تمہاری۔ میں نے اس کی خاطر دس ٹن کی گرلز کو آنٹی جنس بنایا۔ نا ہی میں اس کی خاطر بی اے میں فیل ہوا ہوں۔ اور نا ہی ڈی سی کا بیٹا بنا ہوں"۔

"یہ سب میں نے خود تھوڑی کیا تھا۔ بس کچھ موقعہ ایسا تھا۔ کچھ مجبوری ایسی تھی۔ ... اور پھر تم نے گانوں کے وہ بول ٹیپ کروا لیے جو میں تمہیں سنا رہا تھا؟"

"ہاں۔ پر ان کا کرو گے کیا؟"

"دیکھنا کیا کرتا ہوں"۔ وہ چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے بولا۔ "اچھا تم نظر آئی تھی وہ ان دنوں میں؟"

"میں تمہاری طرح تاک جھانک کا قائل تو نہیں۔ البتہ سامنے کے ٹیرس پہ ٹہل اور صوفی دونوں کی EXTREMS اکثر شام کو نظر آ جاتی تھیں۔ ویسے ہاتھ تم نے اچھا مارا ہے۔ لڑکی خوب صورت تھی ہے"۔

"میرا کوئی ایسا ارادہ نہیں۔ یہ تو بس اسے ذرا تنگ کروں گا۔ کیوں ایک شریف آدمی کو بلا تحقیق کوئی "لوفر" کہے۔ جب تو مجھے اتنا غصہ آیا تھا کہ سامنے ہوتی تو ... " "تب بھی پیار کر لیتے"۔

"سوری۔ میرا آئندہ بھی ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ اگر وہ بڑے باپ کی بیٹی ہے تو اپنے لئے۔ دوسروں کے ساتھ بہرحال تمیز سے پیش آنا چاہیئے"۔

خالی پیالی رکھ کر کمبل اپنے گرد لپیٹتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

"سُنا ہے بہت اچھے لوگ ہیں؟"

"میں نے بھی سُنا ہے مسٹر فصیح احمد بہت شریف ملنسار اور نیک انسان ہیں۔ لیکن ۔ اس سے کیا ہوتا ہے؟ باپ اچھا آدمی ہے تو بیٹی کیوں دوسروں کی بے عزتی کرتی پھرتی ہے"۔

"بھئی تم تو سنجیدہ ہو گئے ہو"۔

"نہیں خیر اتنا بھی نہیں ۔ وہ مسکرایا۔" لیکن ہوں ضرور۔ میں اپنی بلاوجہ بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا"۔

"میں تو کہتا ہوں اب اُسے معاف ہی کر دو" نعیم نے بھی خالی کپ واپس رکھ دیا۔

"ابھی میں نے کیا کیا ہے؟ صرف تعارف ہی تو کروایا ہے اپنا"

"اچھا چھوڑو۔ یہ بتاؤ کیا کیا کھا کر آ رہے ہو؟"

"دُنبے۔ دنبے اور دنبے۔ بس"

"تو آدھا دنبہ چھپا کر ساتھ بھی لے آتے"۔

"آدھا تو نہیں پورا ضرور ساتھ لایا ہوں۔"

"وہ کیوں؟"۔

"بس پیارا لگتا تھا۔ دنبے کا بچہ ہے معصوم سا۔ روئی کے گالوں کی طرح"۔

"دیکھو بات سنو۔ یہ پیار اِدھر اُدھر بیکار مت لٹاؤ۔
سامنے ہی مستحق بندہ دستیاب۔ اُسی کی نذر کردو۔"

"وحشت تیرے کی"۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "اپنا درجہ مجھے اُس سے
ہزار درجے زیادہ پیارا ہے INNOCENT سا جانور"۔

"جانور تو وہ بے شک نہیں ہے۔ لیکن کیا وہ INNOCENT بھی نہیں ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم"۔ وہ کہنی کے بل دراز ہوتے ہوئے بولا۔
جبکہ وہ جانتا تھا کہ وہ بے حد معصوم تھی۔

"یہیں سے مجھے معلوم ہو گیا کہ ضرور وہ معصوم ہے۔"

"تب بھی تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"یعنی کہ تم ضرور اُس سے بدلہ لو گے؟"

"ہاں"۔ اُس نے خوبصورت پلکوں کو اثبات میں جنبش دی۔

"کل مجھے تمہاری آنٹی نے اشارے سے اپنے پاس بلایا تھا۔" نعیم اچانک
بولا۔

"اچھا تو؟" وہ چونک کر متوجہ ہو گیا۔

"پھر بھی بلایا گیا۔"

"پھر؟"

"تمہارا پوچھ رہی تھیں۔ اور دیکھو مجھے اچانک یاد آیا تم نے انہیں اتنا

نام نعیم بتایا ہے ؟"

"کیوں ؟" وہ زور سے ہنس دیا۔

"پوچھتے ہی دس بٹن کی انٹی نے کہا "بیٹا! نعیم کہاں ہے ؟" نعیم نے گزرس کے لہجے میں اُس کی نقل اتاری۔

"پھر تم نے کیا کہا ؟" کامران گھبرایا سا لگنے لگا۔

"گھبراؤ نہیں۔ میں سمجھ گیا تھا یہاں بھی تم نے گل کھلایا ہے۔ میں نے کہہ دیا پشاور گیا ہے۔"

"اوہ۔ بیرا بچا لیا" کامران مطمئن ہو کر پھر لیٹ رہا۔

"تمہاری "اُس" کو بھی دیکھا"۔

"پھر زی ؟" کامران نے پاؤں مار کر اُسے پرے دھکیل دیا۔

"سنو تو"۔

"ہوں"۔

"بہت خوبصورت ہے"

"تو میں کیا کروں ؟"۔

"بس وہ بو فرو الی بات دل سے نکال دو"۔

"تم کیوں سفارش کر رہے ہو ؟"

"تمہارے لئے میرا اور کیا مقصد ہو سکتا ہے"۔

"میرے لئے کیوں؟"

"تو کیا تمہیں کسی لڑکی کی ضرورت نہیں؟"

"فور گوڈ سیک۔ اتنا عرصہ کیا میرے ساتھ لڑکیاں رہی ہیں"

"لیکن اب تو ہونی چاہیئے نا"۔

"کیوں آخر؟"

"تمہیں شادی کا بھی تو سوچنا ہے نا تمہیں"

"اوہ۔ تو تمہیں یہ فکر تھی"

"اور کیا؟"۔

"کوئی اور ڈھونڈ دو"۔ وہ لجاجت سے بولا۔

"جب سامنے مل رہی ہے تو دور جانے سے فائدہ"

"مجھے نہیں چاہیئے یہ"

"کیا برائی ہے اس میں؟"

"تمہیں معلوم ہے"۔

"اس کے باوجود کیا وہ تمہیں متاثر نہیں کرتی؟"

"بالکل نہیں WILL POWER ہونا چاہیئے"۔

"میں تو اسے تمہارے لئے پسند کر کے آ بھی گیا"

"کیا مطلب؟" وہ برہم نظر آنے لگا۔ بشیر سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔

"دل ہی دل میں یار۔" وہ آرام سے بولا۔

"تم ضرور کسی دن گڑبڑ کر دو گے۔" اُسے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

"میں کچھ نہیں کروں گا۔" اُسے کامران کی ہٹ دھرمی اچھی نہ لگی۔ خواہ مخواہ ایک فضول سی بات کو طول دیئے جا رہا تھا۔ "تمہاری WILL POWER کو ہونا چاہیئے۔" اُس کے لہجے میں خواہ مخواہ طنز سا آ گیا۔

"میری WILL POWER اپنی جگہ ہے لیکن تم کیوں ناراض ہو رہے ہو؟"

"ناراض نہیں ہوں لیکن میں دوسری بھی نہیں ڈھونڈ سکتا۔"

"میں خود ڈھونڈ لوں گا۔"

"اسی کو؟" وہ حسبِ عادت بول پڑا۔

"اوں ہوں۔" کامران نے مسکراتے ہوئے سر نفی میں ہلا دیا۔

آج ساری دوپہر کی زبردست محنت و مشقت کے بعد وہ واقعی بہت لذیذ Cheese Cake Pie بنانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ یہ اُس کی پسندیدہ ترین ڈشوں میں سے ایک تھی۔ گیس کے چولہے پر مزیدار سی چائے بن چکی تھی۔

"ٹرے میں برتن سجا دیئے ہیں؟" اُس نے پیچھے مڑتے ہوئے نعیم سے پوچھا۔

لگا دیتے ہیں"۔ وہ چائے کے کپ ٹرے میں رکھتے ہوئے منہ پھلائے پھلائے
بولا۔

"آؤ، یہ چائے بھی رکھ دو۔" کامران کیتلی سے چائے چائے دانی میں انڈیلتے
ہوئے بولا۔ "میں اوون سے پائی نکالتا ہوں"۔ وہ اوون کی طرف جھکا۔

"ہوں"۔ اس نے چائے دانی اٹھا کر ٹرے میں رکھ دی۔

"اوپر سے cover کر دو"۔ اسی طرح جھکے جھکے اس نے ہاتھ بڑھا کر
ٹی کوزی اٹھاتے ہوئے اس کی طرف اچھالی۔

"کور کر دیا ہے"۔ وہ مزید ناراضگی سے بولا۔

"اب تو موڈ ٹھیک کر لو۔ پائی اچھی بن گئی ہے"۔ وہ گرما گرم سنہری پائی ڈش
میں اٹھائے ٹرے کی طرف بڑھا۔

"میں کہتا ہوں یہ سب کل بھی بن سکتا تھا۔ ساری دوپہر غارت کر دی۔
ضروری خط لکھنا تھا"۔ وہ بڑبڑایا۔

"کل یہ پائی بنانا نہیں جانتا تھا۔ میں نے پوچھا تھا اس سے۔ اور دوپہر
کیا خط لکھنے کے لیے ہوتی ہے؟" کامران ٹرے دونوں ہاتھوں میں اٹھائے
ہوئے دروازے کی طرف بڑھا۔

"تم تو حد ہی کرتے ہو۔ دوپہر کو جس سکون سے خط لکھا جا سکتا ہے، وہ کسی
اور وقت میں ممکن نہیں ہوتا"۔ نعیم اس کے لیے دروازہ کھولتے ہوئے اس

کے ساتھ ساتھ چلا آیا۔

"یہ اتنے گھرے سکون کی ضرورت کیوں پیش آگئی ہے؟"

"بس آگئی"۔ وہ ہنس دیا۔

"مجھے معلوم ہے سمینہ کو تکتے رہتے ہو"۔ وہ برآمدے میں چلتے ہوئے بولا۔

"وہ بھی مجھے تکتی رہتی ہے"۔

"میں برا تو نہیں مانتا۔ سمجھو دونوں بہن بھائی ہو آپس میں"۔

"بدمعاش"۔ نعیم نے ہوا میں مکا لہرایا۔

اور کامران نے آگے بڑھ کر برآمدے کے آخری کونے میں اپنے بیڈروم کے قریب رکھے میز پر پڑے رکھ دی۔

"ہم بہن بھائی ہیں؟"۔ وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"کزنز ہوتے ہی بہن بھائی ہیں لاکھ نکاح ہو جائے"۔ وہ اب بھی ہنس رہا تھا۔ "کزن سے منگنی شادی۔ میں تو حیران ہوتا ہوں۔ کیسے ذہن و دل تیار ہو جاتے ہیں؟"

"جبھی کزن کے علاوہ تاک جھانک ہو رہی ہے"۔ نعیم نے چھری سے پالی کاٹتے ہوئے دائیں رخ ٹیرس کی طرف آنکھ سے اشارہ کیا۔

"جلیبر!"۔ کامران اپنے لئے چائے بناتے ہوئے اچانک سنجیدہ ہو گیا۔ "میری سوچ بھی اس طرف نہیں جا سکتی"۔

"سوزن پرکس کا چہرہ ہوتا ہے؟" ۔

"میں پھیرے لگا سکتا ہوں"

"تم پھیرے دار باؤ ۔ میں پائی کھا رہا ہوں ۔ ویسے بھی بہت لذیذ ہے طافی اچھے لگ رہے مزے ہوں گے بی پڑوسن کے ۔ بڑے بڑے اچھی بہترین پائی بنا یا کرے گی "

"بکتے جاؤ" ۔ وہ بھی پائی کے مزے لیتے ہوئے بولا ۔

"میری بات کو مذاق مت سمجھنا میں جو پیشن گوئی کرتا ہوں ہمیشہ ٹھیک نکلتی ہے "

"اس سال پاس ہو جاؤ گے ؟" ۔ کامران نے اچانک پوچھا ۔

اور نعیم کی زبردست ہنسی چھوٹ گئی ۔

"وہ دیکھو تیری پڑوسن ٹیرس پر تشریف لے آئی" کامران نے ایک دم ہی کہا ۔ نعیم نے گردن موڑ کر دیکھا خوبصورت کمونو ڈریس پہنے لمبے بال پشت پر کھلے چھوڑے چند کتابیں ہاتھ میں لیے وہ بیٹھنے کی تیاری کر رہی تھی ۔

بیٹھے بھی اس رخ ہو جہاں سے پڑوسن کا دیدار ہو سکے ۔ اور نعیم مسکرا بھی رہے تھے ۔

"کمونو پہنے اچھی لگ رہی ہے" ۔ کامران مزید بولا ۔

جبکہ اس میں شک بھی نہیں تھا ۔ ریشمی اودی پھولدار کمونو پہنے سنہری لمبے بال پشت پر لہراتے وہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق لگ رہی تھی ۔

"کامران!"۔

"جی"۔ وہ مودب طریق سے بولا۔

"تمہیں یہ لڑکی واقعی اچھی نہیں لگتی؟"۔

"قطعی نہیں"۔

"کوشش کرنے میں کیا حرج ہے؟"۔

"یعنی میں کوشش کرکے اسے پسند کروں؟"

"ہاں"۔

"لیکن کیوں؟"۔

"گھر اچھا لڑکی اچھی ہے"۔

"تم ذہن پر بوجھ نہ ڈالو جب تک میں پانی اسے بچھا کر آتا ہوں"۔ وہ پلیٹ ہاتھ میں لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"چھوڑ یار" نعیم نے پلیٹ واپس جھپٹ لی "پسند بھی نہیں ہے۔ پانی بھی دینے جا رہے ہو۔ تم نے ابھی کھائی ہی کتنی ہے؟"۔

"تمہیں معلوم ہے میں کیوں ایسا کر رہا ہوں"۔

"سب بہلانے ہیں"۔

"کوئی بہانہ نہیں ہے"۔ وہ آدھی پائی نعیم کی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے باقی اٹھا لے گیا۔

اور بغیر بڑے بڑے قدم اٹھاتا ہوا وہاں جا پہنچا۔

جانے کیوں؟ لڑکی آسے اکیلے میں دیکھتے ہی گھبرا سی گئی۔ وہ دل ہی دل میں محظوظ ہوا۔

"یہ پائی کھائیے میں نے خود پکائی ہے" وہ بغیر کسی تمہید کے پلیٹ اس کے آگے وہاں میز پر بالفظ مبارک کے کھسکاتے ہوئے بولا۔

"شکریہ۔ میں نہیں کھاؤں گی" وہ کتاب کھول کر خالی خالی نظریں سطروں پر ڈالتے ہوئے بولی۔

"دیکھیں آپ میرا دل توڑ رہی ہیں"

اور وہ ایک خشمگیں نظر اس پر ڈال کر رہ گئی۔

"شاد بیٹے کیا حال ہے۔ پشاور کا چکر لگا آئے ہو؟" اچانک ہی بھاری بھرکم گورنس نمودار ہوتے ہوئے شفقت سے اس کا حال پوچھنے لگیں۔

"جی شکریہ ٹھیک ہوں۔ یہ پائی میں نے خود پکائی ہے۔ آپ لوگوں کو کھلانے لے آیا تھا"

"خوب۔ ضرور کھائیں گے بیٹا"۔ وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے پیس بڑا سا پیس توڑ کر منہ میں ڈالتے ہوئے بولیں۔

"جی شکریہ"۔ وہ ایک نظر حزیں ہوتی مس فضیح احمد پر ڈالتے ہوئے عاجزی سے بولا۔

"کیسے رہے اتنے دن؟ میں تو یاد ہی کرتی رہی"
"آپ نے یاد کیا تھا مجھے؟" وہ پھر جاپانی گڑیا کی آنکھوں میں جھانکا۔
اور اُس نے یہ سب برداشت نہ کرتے ہوئے ہاتھ میں پکڑی کتاب آنکھوں کے سامنے کرلی۔
کامران دل کھول کر ہنس دیا۔ نورس نے چونک کر اُسے دیکھا۔ وہ اب بھی اُسے دیکھ دیکھ کر ہنس رہا تھا۔
"یہ۔۔۔ یہ پنیر کھائیں گی؟" اُس نے معصومیت سے لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔
"ارے بیٹی! میں تو تمہیں پوچھنا ہی بھول گئی۔ مزیدار ہی اتنی ہے کہ بس کیا بتاؤں۔ لو بیٹی! یہ قیمہ کھاؤ"۔ وہ پلیٹ اُس کی طرف کھسکاتے ہوئے بولیں۔
"شکریہ ماما۔ میرا دل نہیں کر رہا اس وقت"۔ کتاب اب بھی اُس کے چہرے کے آگے تھی۔
"چکھ کر تو دیکھو دل خود بخود ہی کرنے لگے گا۔ اتنی خستہ بنائی ہے۔ میں تو حیران ہوں۔ ایسی مزیدار چیز تو ہمارا خانساماں بھی نہ بنا سکے گا"
"شرماتی ہیں شاید"۔ وہ احمقوں کی طرح بولا۔ "لیجیے میں چلا جاتا ہوں۔ پھر ضرور کھالیں گی"
اور مس نغمہ نے جھٹ کتاب چہرے کے آگے سے ہٹا کر اُسے گھورا جو۔۔۔

اُس کی طرف جھپٹ گئے وہ اپنے برآمدے کی طرف چلا جا رہا تھا۔
"بدتمیز کہیں کا"۔
"کیوں بیٹی ؟"۔ ماما اب بھی کھانے میں مصروف تھیں "اُس نے تو کوئی ایسی حرکت نہیں کی"۔
"میں ۔ میں اس سے شرماؤں گی ؟"۔ وہ غصہ ضبط نہ کر سکی۔
اور پھر اُس نے ماما کے بہت اصرار پر بھی وہ پائی نہ کھائی۔
"میری کھالو بیٹی ! ورنہ دل ٹوٹ جائے گا بے چارے کا"۔ وہ اطمینان سے باقی مانده پر بھی ہاتھ صاف کرنے لگیں۔
اور وہ کوفت زدہ سی کتاب کے صفحے اُلٹنے لگی۔
"میں پانی پی کر آتی ہوں ۔ اتنی چٹپٹی تھی۔" ماما چٹخارے لیتے ہوئے پانی کے لئے اندر چل دیں۔
اور جیسے میدان صاف دیکھ وہ پھر چلا آیا۔
"پلیٹ دے دیجئے"۔
اُس کا دوبارہ آنا اُسے سخت ناگوار گزرا مگر پھر بھی پلیٹ اُسے دینا ہی پڑتی وہ پلیٹ لئے ریلنگ تک آگئی۔ ہاتھ بڑھا کر پلیٹ اُس کی طرف بڑھائی ساتھ ہی اس کے کھلے سنہرے بال اُس کے بازو پر سے پھسلتے ہوئے پلیٹ پر پھیل گئے۔ کامران نے ہاتھ بڑھایا۔ اطمینان سے اس کے بال اپنے ہاتھ میں اٹھائے

گئے اور آہستہ سے اُس کے شانے پر اُچھال دیئے۔ پھر غور سے اُس کی آنکھوں میں دیکھا۔ اور پلیٹ لیتے لیتے اپنا ہاتھ اُس کے بے حد نازک ہاتھ پر رکھ دیا۔
وہ اب بھی بڑے غور سے اُس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

اُس نے دیکھا اُس کی بے حد خوبصورت سنہری جھالروں جیسی پلکیں تھرتھرا کر جھک گئی تھیں۔ اور چہرہ کانوں کی لوؤں تک سرخ ہو گیا تھا۔

وہ بولی کچھ نہیں۔ شاید اپنا شدید غصہ برداشت کر رہی تھی۔ یا پھر اپنے رنگ و روپ میں دوڑتی سنسنی پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

بہر حال اُس کے ہاتھ پر سے اپنی گرفت ہٹاتے ہوئے اُس نے پلیٹ پکڑی اور مسکراتے ہوئے واپس چلا آیا۔

نسیم کے سامنے پیش کردہ کھل کر ہنس دیا۔ اور نسیم سچ مچ ناراض نظر آنے لگا۔

"کیوں خیریت" ۔ کامران اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔

"یار تم مجھے بیوقوف بنا رہے ہو اور یا پھر خود بیوقوف بن رہے ہو۔"

"دونوں میں سے ایک بھی بات نہیں ہے" "وہ خوبصورتی سے ہنستے ہوئے بولا جبکہ ابھی تھوڑی دیر قبل اس کا ہاتھ تھامتے ہی اُس نے ایک واضح سا بجلی کے کرنٹ سے ملتا جلتا shock سا ہی محسوس کیا تھا۔

لیکن منیبت اور سنی بجا ہوں گے۔ تو shock تو پیدا ہو گا ہی۔ اُس نے فوراً خیال جھٹکا۔

ہے اور ضرور ہے۔"

"اوں ہوں" — وہ پورے وثوق سے بولا۔

"اچھا کھلا آئے پانی"۔

"نہیں"۔

"کیوں؟"

"ناراض ہے"

"تو منالو"۔

"میں ایسے کام نہیں کیا کرتا"

"تمہاری آنٹی "پھولوں کی دوزن والی" نے کچھ کھایا؟"

"کچھ نہ، اُس نے تو پوری پلیٹ صاف کر دی ہے"۔

"لاحول ولا، میں کیا نہیں کھا سکتا تھا جو تم نے ساری پلیٹ اُس کے آگے رکھدی جاکر" — اُس کا دل واقعی ابھی سیر نہیں ہوا تھا، پھر اتنی محنت الگ کی تھی۔

"اُس کے آگے تھوڑی رکھی تھی"

"پھر کس کے آگے رکھی تھی؟" — وہ مزید غصے میں بولا۔

"جاپانی گڑیا کے"۔

"کیا؟"۔

"ہاں" — وہ آرام سے بولا۔

"اب کچھ کہوں گا تو پھر عزت سے لگو گے۔"

"نہیں کر دوں گا۔"

"جاپانی گڑیا پر دل آگیا نا؟"

"حضور کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس دل کا کسی پر آجانا کافی مشکل ہے۔ اور پھر اس جاپانی گڑیا پر۔" اس کے لہجے میں تمسخر پوشیدہ تھا۔

"اچھا میں چلتا ہوں جاگو۔" نعیم کرسی پر سے کسمساتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ "اور اگر تم برا مانو تو میں تمہارے پہلو میں بیٹھ کر نماز پڑھ لوں گا۔"

کامران بھی اس کے ساتھ

ساختہ اندر کی طرف چل دیا۔

آج پھر بادل گھر آئے تھے۔ سیاہ بادل کسی مست خرام کی طرح ایک دوسرے کو روندتے۔ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہوئے آکاش کو گھیرے میں لیے ہوئے تھے۔

بڑی تیز ہوا چل رہی تھی۔ قریب ہی سیب کے درخت ہوا کی تھپیڑ تھپاڑ سے غیر متوازن ہو رہے تھے۔ سرخی مائل سیب اس وقت بھی جھول رہے تھے۔

رہے تھے۔

اپنے بالتھ روم کے آگے برآمدے کے مرمریں ستون سے ٹیک لگائے دونوں بازو سینے پہ باندھے وہ ماحول کے حسن سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اُس نے اوپر نگاہ کی۔ سیاہ بادل اور سیب کے درخت آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ بادل درختوں کے پتوں اور سیبوں کے بیچوں بیچ دھوئیں کی طرح تحلیل ہو ہو کر گزر رہے تھے۔ کتنا انوکھا سماں تھا۔

وہ دھیرے دھیرے چلتا برآمدے کی سیڑھیاں اترنے لگا۔ پھر اس کی نظر دائیں طرف پڑی جس فصیح احمد بھی سکارلٹ ریڈ گرم سوٹ پہنے اسی کا ہم رنگ دوپٹہ کندھوں پہ ڈالے بال اب بھی کھلے تھوڑے کپڑوں سے ہم رنگ چوڑے سے بینڈ سے سنبھالے ریلنگ کے سہارے کھڑی کھلی گھٹاؤں میں جانے کیا تلاش کر رہی تھی۔

اُسے دیکھتے ہی کامران کے لبوں پہ دلنشین مسکراہٹ بکھر گئی۔ آگے بڑھ کر وہ سیبوں والی ڈھلان پہ چڑھ گیا۔ تھوڑی دیر یوں ہی کھڑا ادھر اُدھر دیکھتا رہا۔ اُسے ماننا پڑ رہا تھا۔ کہ جب سے وہ آیا تھا۔ ہر روز اور ہر لمحہ موسم اور اطراف اس قدر حسین ہوتے تھے۔ کہ کبھی اُسے یکسانیت یا بوریت کا احساس نہ ہوا تھا۔

آگے بڑھ کر اس نے ایک بڑا سا سیب توڑ لیا۔ ہاتھوں میں مل کر صاف کیا

اور بڑا سا ٹکڑا دانتوں سے کاٹ کر کھانے لگا۔ باغ کے سیب اگرچہ پوری طرح ابھی پکے نہیں تھے۔ مگر پھر بھی بہت خوش ذائقہ تھے۔

اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ مس صبیحہ احمد ندی کی طرف رخ کئے ماحول کے سحر میں یوں کھوئی تھی۔ کہ کسی جنبش کا احساس تک نہ ہو رہا تھا۔

تبھی اس کی آنکھیں شرارت سے چمک اٹھیں۔ ہونٹوں پر شوخی سی کھیلنے لگی۔ اس نے ایک اور بڑا سا سیب توڑا۔ اچھی طرح نشانہ لیا۔ اور تاک کر مس صبیحہ احمد کی کمر میں دے مارا۔ اگرچہ اسے یہ احساس پورا تھا۔ کہ سیب بہت بڑا، اس کی کمر بہت نازک اور وار کافی بھاری تھا۔

اس اچانک حملے پر وہ اپنی چیخ روک نہ سکی۔ وار بھی اچانک تھا۔ اور چوٹ بھی یقیناً آئی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ جہاں سے وار کیا گیا تھا۔

"کھائیے نا" اپنا سیب پھر دانتوں سے توڑتے ہوئے اس نے اس کی طرف پھینکے ہوئے سیب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بڑے مزے سے کہا۔

"بدتمیز" وہ تکلیف سے تڑپتے ہوئے غصے سے چیخی۔

اور کمال کو پہلی بار احساس ہوا۔ کہ یہ نہیں کہ اس کا یہ مذاق اخلاق کے منافی تھا۔ بلکہ اس کا کہ صنف نازک کے لئے یہ وار کافی تکلیف دہ تھی خاص کر اس چھوٹی سی، نازک سی، کانچ ایسے بدن والی لڑکی کے لئے۔

وہ پہاڑی سے واپس اترتے ہوئے اس کی طرف چل پڑا۔

"جی کیا فرمایا آپ نے؟" ۔ پاس جا کر اُس نے مسکین سی شکل بنا کر پوچھا۔

"آپ سخت بدتمیز ہیں۔ فریبی ہیں" ۔ اُس کی شربتی آنکھیں چوٹ کی

تکلیف سے جھلملائی ہوئی تھیں۔ مگر آواز میں تیز ناراضی تھا۔

"بجا فرمایا آپ نے" ۔ وہ گردن کھجاتے ہوئے اُس کی ڈبڈبائی آنکھوں

میں تکتے ہوئے بولا۔

"آپ چلے جائیں یہاں سے" ۔ وہ آپے سے باہر ہی تو ہو گئی۔

اور ساتھ ہی آنسو ڈھلک کر اُس کے چکنے گلابی گالوں پہ آ رہے۔

"اور اگر میں نہ جاؤں تو؟" ۔ اُس نے اس عجیب انداز سے اُس کی

آنکھوں میں دیکھا۔

کہ وہ پلکیں گرائی اُٹھاتی رہ گئی۔ اور کامران کو آج پہلی بار اس پہ ترس

آیا۔ اُس کی ڈھٹائی سے لاجواب ہو کر وہ مڑی۔ اور دو قدم آگے چل کر

سیڑھیاں اترتی ندی میں اُتر گئی۔

اُسے اپنے رویے پر ندامت سی ہوئی۔ اپنا سیب اب بھی اُس کے

ہاتھوں میں تھا۔ وہ آگے چل پڑا۔

پھر جانے کیسے؟ خود بخود ہی اُس کے قدم ندی میں اُترتی سیڑھیوں

پر چل پڑے۔

"آپ۔ آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟" ۔ اُسے وہاں دیکھ کر ایک پل کو

وہ واقعی ہراساں نظر آنے لگی تھی۔

"کیا پتہ" ۔ وہ عجیب بیچارگی سے بولا۔

"آپ جانتے کیا ہیں؟" وہ سنبھلتے ہوئے پوچھنے لگی۔ مزید کمزوری کا مظاہرہ کرنا اُسے اچھا نہ لگا۔

"ہیں؟ کچھ نہیں۔ سیب کھائیں گی؟" وہ اُسی سیب سے خنجر دانتوں سے کاٹ کر باقی اُسے پیش کرتے ہوئے بولا۔

اور وہ چہرے پر آئے بال ہاتھ سے ہٹاتے ہوئے ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔

"آپ کے ہاتھ بہت خوبصورت ہیں" وہ اچانک بولا۔

اور اُسے وہاں سے بھی جانا پڑ گیا۔

"میں آپ کے فادر سے آپ کی شکایت کردوں گی" اپنی طرف کی سیڑھیوں پر قدم بڑھاتے ہوئے وہ سنجیدگی سے بولی۔

"پلیز! آئندہ ایسا نہیں ہوگا"

"جو ہو چکا ہے وہ کافی سے زیادہ ہے" ۔ وہ رخ موڑے بغیر آگے بڑھتی گئی

"آپ میری شکایت نہیں کریں گی!" اُس نے پیچھے سے آواز دی

"ضرور اور ضرور کروں گی" ۔ آخری سیڑھی پر پہنچتے ہوئے اُس نے کہا۔ اور آگے چل پڑی۔

اس نے باقی بچا سیب پانی میں پھینک دیا۔ چند سے دور تک اُسے
پانی میں ڈوبتے جاتے دیکھتا رہا۔ پھر واپس مڑا۔
اپنی سیڑھیاں چڑھا۔ ایک نظر ٹیرس پر دیکھا بس نعیم احمد اندر جا چکا
تھا۔
دونوں ہاتھوں کی انگلیاں نادانستگی میں آپس میں اُلجھاتا وہ سوچوں میں گم
دھیرے دھیرے قدم اٹھا رہا تھا کبھی خوبصورت چہرے پہ سنجیدگی چھا جاتی
اور ــــــ
کبھی خود بخود ہی دلکش ہونٹوں پر بڑی سی مسکراہٹ اُبھر آتی۔
"بدتمیز"۔ اپنے بیڈ روم میں قدم رکھتے ہی اسی کے بستر میں گھسے نعیم
نے زوردار خیر مقدم کیا۔
"اوہ۔ تو تم چوکیداری میں مصروف تھے"۔ وہ کوٹ اتار کر صوفے پر پھینکتے
ہوئے بولا۔ "کب آئے؟"
"عین "بدتمیز" کے وقت۔ تم سے کیا خطا سرزد ہوئی تھی بیڈ روم کی"؟
"ابھی بتاتا ہوں آکر۔ وہ ہنستے ہوئے کپڑے بدلنے ڈریسنگ روم میں
گھس گیا۔ اور پھر فارغ ہوتے ہی دو منٹ میں وہ نعیم کے سامنے بیٹھا تھا۔
"ہاں تو سناؤ"۔ گرم کوفی کا کپ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے نعیم بولا۔
اور کامران نے ایک گہری سانس لی۔ "سیب مارا تھا کمرے میں ناک پر"

"خدا کے لئے کامران مذاق اس طرح کیا جاتا ہے" وہ اپنا کپ وہیں چھوڑ ناراض نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔

"میں مذاق تھوڑی کر رہا ہوں۔ میں تو اُس سے اپنا بدلہ لے رہا ہوں"
وہ بازار قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

"کیپر؟۔ اُس نے اپنی الفاظ سے نوازا ہوگا"۔

"ہاں"۔

"ویسے ڈھیٹ خاصے ہوگئے ہو"۔

"واقعی۔ عام حالات میں میں ان الفاظ کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا"۔

"ہوں ...." نعیم اُسے معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگا۔

"اور پھر وہ لگی تھی" وہ مزید ہنستے ہوئے بتانے لگا۔ "کہیں ایسی ویسی جگہ لگ جاتا اور لینی پڑ جاتی تو؟"۔

"چھوڑو یار! بلی کی سانس پائی ہے۔ ایسی آسانی سے مرنے والی نہیں" ساتھ ہی اُسے جانے کیوں؟

اُس کا بے حد نازک بدن اور آنسوؤں سے ڈبڈبائی سُرخی آنکھیں یاد آئیں۔

"اچھا پھر؟"

"وہ پانی میں اتر گئی۔"

"ہوں"۔

"میں بھی اتر گیا"۔

"تمہیں جانے کب شرم آئے گی۔ اتنی تنگ سی ندی میں اس کے ساتھ اترتے ہوئے تمہیں شرم نہ آئی"۔

"بالکل نہیں۔ ویسے وہ واقعی گھبرا گئی تھی مجھے وہاں دیکھ کر جگہ بھی بالکل تنگ سی ہے نا۔ ایک طرف پہاڑی ہے۔ باقی دو طرف کوٹھیاں ہیں اونچی اونچی۔۔۔۔"

"بس اب تفصیل رہنے دو۔ جگہ میں نے دیکھی ہے۔ آگے بتاؤ"

"میں نے اس کے ہاتھوں کی تعریف کر دی"

"دل سے؟"

"نہیں"۔

"تو کیا اس کے ہاتھ قابل تعریف نہیں ہیں؟" نجم نے اچانک پوچھا۔

"کچھ کہہ نہیں سکتا" اس نے خالص جھوٹ بولا۔ اس کے ہاتھوں سے متاثر ہو کر ہی اس نے ان کی تعریف کی تھی۔

"کیوں نا؟"

"اس لئے کہ میں نے انہیں اس نظر سے نہیں دیکھا تھا"۔ اس نے اب بھی غلط بیانی سے کام لیا۔

"اچھا پھر؟ خوش ہوئی سن کر؟"

"ارے کہاں! وہ تو دھمکی دیتی ہوئی اپنی سیڑھیاں چڑھ گئی"۔

"مثلاً؟"

"کہ وہ میری شکایت کر دے گی"۔ اس نے مسکراتے ہوئے خالی کپ میز پر رکھا۔

"کس سے؟" نعیم بھی کھل کر ہنس دیا۔

"میرے فادر سے"۔

اور نعیم قہقہے لگا لگا کر ہنسنے لگا۔

"یعنی تمہارے باپ سے؟"

"ہاں"۔

"جو یہاں کا ڈی سی ہے"۔

"یقیناً"۔

اور پھر دیر تک اُن کے جاندار قہقہے در و دیوار سے ٹکراتے رہے۔

رات ہی وہ دو دن کے دورے کے بعد گھر پہنچا تھا۔ آج آفس
سے وقت پر ہی چھٹی ہو گئی تھی۔ کھانا کھانے ہی باوجود نعیم کے چھیڑ چھاڑ
کے وہ اُسے کمرے سے نکال باہر کر کے لیٹا رہا۔
رات اُسے مقامی ٹھیکیدار کے یہاں ڈنر پر بھی جانا تھا۔ واپسی
یقیناً دیر سے ہوئی تھی۔ وہ کل کا خاصا تھکا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر سو کر
آرام کر لینا ضروری سمجھا۔
اور پھر ڈھائی بجے کا سویا وہ پانچ بجے ہی اٹھا۔ طبیعت خاصی ہلکی
معلوم ہو رہی تھی۔ منہ ہاتھ دھو کر اُس نے کمرے میں ہی نعیم کے ساتھ چائے
پی۔ پھر اٹھ کر
الماری سے وہ تصویریں نکالیں، جو آج ہی دھل کر آئی تھیں، اور جن
میں وہ تصویریں بھی تھیں، جو اُس کے یہاں جانچ لینے کے دنوں میں کھینچی
گئی تھیں۔ نعیم نے دیکھ کر خاصی تنقید آرائی کے بعد اُسے واپس دیں۔
پھر تصویریں واپس رکھتے رکھتے کامران کی نظر اپنی پستول پر گئی۔ اٹھا کر
کچھ دیر ہاتھ میں لیے الٹ پلٹ کرتا رہا۔ پھر

اچانک ہی اُس کی آنکھیں شرارت سے چمک اُٹھیں۔ ہونٹوں پر شوخ مسکراہٹ اُبھر آئی۔

"آؤ اپنا نشانہ آزمائیں"۔ وہ اچانک بولا۔

"چلو"۔ نعیم ٹانگوں پر سے کمبل پرے ہٹاتے ہوئے بولا۔ اُسے بھی کھیل دلچسپ معلوم ہوا۔

دونوں کوریڈور میں نکل آئے۔ کامران نے قدم اندرونی سرے پر آمنے میں کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھائے۔

"اس طرف نہیں مس فصیح احمد داماں کی گورنس ٹیرس پہ بیٹھی ہوں گی" نعیم مخالف رُخ کی طرف ہو لیا۔

"نہیں اسی طرف ہوگا" کامران کا تو مقصد ہی یہی تھا۔ فیصلہ کن آواز میں بولا۔

"بھئی ایسی کیا بات بھی کوئی چیز ہے" نعیم کسی طرح تیار نہیں تھا۔

"اس نام کی ہر چیز میں شروع دن سے اس ندی میں پھینک آیا ہوں" ندی کے رُخ اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"نہیں کامران! تنگ کرنے کی بھی آخر حد ہوتی ہے۔ لیڈیز آخر لیڈیز ہوتی ہیں۔ میں ایسا نہیں کروں گا"

"نہیں کرنا پڑے گا" اُسے ہاتھ سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے وہ بولا۔

"چلیں کامران"

"چلیں! ۔ اور ساتھ

ہی وہ نعیم کو کھینچتا ہوا دروازے سے باہر لے گیا۔

تھوڑی دیر برآمدے میں کھڑا نظروں ہی نظروں میں جگہ پسند کرتا رہا۔ پھر

خوبصورت آنکھیں چمکنے لگیں۔

"وہاں ٹھیک رہے گا" پیرلیس سے قریب ترین ندی کے اوپر

والی جگہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔

"ہرگز نہیں" نعیم بھڑکا۔ "ان لوگوں کے اتنے قریب؟

آخر اخلاق بھی کوئی چیز ہے" ۔ وہ دیکھ رہا تھا۔ کامران

عین اس جگہ کا نشانہ لئے جا رہا تھا۔ جہاں سے صرف دو تین

فٹ کی اونچائی پہ مس فصیح احمد اور اس کی گورنس اطمینان سے بیٹھیں

باتوں میں مصروف تھیں۔

"تم کیوں شرمندہ ہوتے ہو۔ الزام تو ویسے بھی مجھے ہی دیا جائے گا۔

موقر تو میں ہی ہوں" وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"پھر تم ہی کرو۔ میں تماشہ دیکھوں گا" وہ مرمریں ستون کی اوٹ

میں ہوتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے" ۔ وہ مصالحت پہ اتر آیا۔

کامران نے نشانہ لیا۔ اچھی طرح۔ اور پھر اچانک ہی زور سے۔

اُن دونوں کے بالکل قریب سے ۔۔ ٹھاہ کی آواز آئی۔

مس فصیح احمد اچھل کر چیختے ہوئے جیسے بے ساختہ گورنس سے جا لپٹی تھی۔

اسے دیکھ کر تو نعیم بھی اپنے اوپر قابو نہ پاسکا۔ اس کا قہقہہ چھوٹ ہی گیا۔

گورنس بھی کچھ کم خوفزدہ نظر نہ آتی تھیں۔ تھوڑے سے توقف کے بعد اُن کے

کے ہوش بجا ہوئے۔ اور مس فصیح احمد نے نظروں ہی نظروں میں اپنے یقینی

چور کو تلاش کر کے گھورا۔ تو کامران نے بڑے دانت نکالتے ہوئے اس

کی طرف ہاتھ ہلا دیا۔ جیسے اپنے بالکل صحیح نشانے کی داد وصول کر رہا ہو۔

"You idiot" وہ مزید برداشت نہ کر سکی۔ اسے تو یقین

تھا۔ یہ اسی نے محض اُس کو تنگ کرنے کو کیا تھا۔

"فرمائیے کیا حال چال ہیں؟" ان سے ہنسی کرتے ہوئے

قریب جا کر اس نے خوش اخلاقی سے ان کا حال دریافت کیا۔

"بیٹے تم نے تو ہمیں ڈرا ہی دیا۔"

"ارے نہیں آنٹی۔ ٹھاہ۔ ٹھاہ۔" اس نے مخالف سمت پہ مزید

دو فائر کر دیئے۔ "اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے؟" رخ واپس موڑ کر

مس فصیح احمد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دبے دبے لاپرواہی سے بولا۔

"او نو اللہ"۔ اب کے مس فصیح سے زیادہ گورنس گھبرا گئیں۔

اور کامران نے ہنسی کے جیسے پانیوں میں ایک اور فائر کر دیا۔

"کیوں؟ آپ بھی ڈرتی ہیں کیا؟" وہ مس فصیح احمد کی بے حد خوشنما

آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بے نیازی سے پوچھنے لگا ۔۔۔ اور

مس فصیح کا دل چاہا۔ اس کے سارے بال نوچ ڈالے۔

"آنٹی پلیز! جو بعد میں کیجیے؟" وہ دو ٹکے سے اونچے کان ڈھانپے گورنس

سے مخاطب ہوا "کم از کم آپ جیسی خاتون کا دل تو بہت بڑا ہونا چاہیے"۔

ان کا وزن کافی سے زیادہ تھا۔ جبھی دل بھی بڑا ہونا چاہیے تھا اسی انداز

سے۔

کوئی اور وقت ہوتا تو مس فصیح احمد گورنس کی حالت اور کامران کی بات

پر ہنسنے کو تیار رہتی۔ مگر اس وقت ۔۔۔ اس وقت تو مارے اشتعال کے

پاگل سی ہو رہی تھی۔ گورنس کو وہیں چھوڑ چھاڑ کھٹ پٹ کرتی اپنے

کمرے میں جا گھسی۔

"بیٹے تم لوگوں کے ہنسنے کھیلنے کے دن ہیں!" وہ کامران کی بات پہ

آنکھیں کھولتے ہوئے کہنے لگیں "اپنا تو بس ۔ توبہ توبہ جیسے میرا تو اب بھی

دل کانپ رہا ہے ۔ اور ۔۔۔ یہ شائی کہاں چلی گئی؟" ۔

تو محترمہ شائی کہلاتی ہے۔ مس فصیح احمد جیسے ثقیل تنا طلسم کے برعکس

"پیارا سا" ۔ چھوٹی موٹی سا نام!

ننھا سا، نازک سا۔ کانچ ایسے بدن سے بنا جلتا سا۔

"شائی؟"۔

"ہاں بیٹے شائستہ نام ہے۔ پر ہمارے صاحب لاڈ سے" شائی" کہہ کر پکارتے ہیں"۔ گورنس نے وضاحت کر دی۔

"بہت مناسب نام رکھا ہے انہوں نے۔ آپ انہیں گلوکوز اور چکن سوپ پلایئے گا۔ خون کافی خشک ہوا ہوگا۔ تجویز بھی کرایئے گا کسی اچھے بزرگ سے"۔

"بیٹے تم تو ہمارا مذاق ہی اڑانے لگے"۔

"نہیں آنٹی! بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔ میں اور آپکا مذاق اڑاؤں؟ ہاں مس فصیح! ان کا رنگ ضرور اڑ گیا تھا۔ سو سب ہاتھ ملانے سے بیچ گیا؟" وہ ہنسنے ہوئے بولا

آنٹی بھی ساتھ دینے لگیں۔ یہی تو عمر ہوتی ہے ہنسنے کھیلنے کی۔ وہ سوچنے لگیں۔

"اچھا آنٹی اب اجازت"۔

"اللہ کامیاب کرے۔ سرفراز ہو"۔

"شکریہ"۔ کامران نے کہا۔ اور

وہاں سے چلا آیا۔ نعیم برآمدے میں نہیں تھا۔ اندر جا چکا تھا شاید۔

"آج شکایت یقینی ہے"۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی نعیم کی شکل دیکھ کر وہ بولا۔

اور نعیم کی آنکھ جو قدرے کم ہونے والی تھی۔ اسے دیکھتے ہی فلک شگاف

قہقہوں میں بدل گئی۔

اُس نے پستول کی باقی گولیاں نکالیں اور سنبھال کر دونوں چیزیں الماری میں رکھ دیں۔

وہیں ایک طرف بھنی مونگ پھلیوں کا پیکٹ پڑا تھا۔ اُٹھا لیا۔ کھول کر چند دانے منہ میں ڈالے۔

"لو کھاؤ۔" کچھ ہاتھ میں نکال کر نعیم کو پیش کیے۔

"تھینک یو ڈیڈی" وہ زور سے بولا۔ "جب اتنے ہی دانے ہمارے رکھے ہیں۔"

اور کامران کے بڑی دیر کے رکے قہقہے چھوٹ ہی گئے۔

"اس موٹی کو میں نے کہہ دیا ہے۔ خوب سوپ وغیرہ پلائے پگلی کو۔ خون کافی خشک ہوا ہوگا۔"

"تم نے بھی حد کر دی کامران۔"

"ابھی میدان صاف ہے۔ نہ اپنے سر پر کوئی بزرگ موجود ہے۔ نہ مسٹر فہیم احمد تشریف لا رہے ہیں۔ تب جی میں آئے گا کریں گے۔"

"ابھی اور بھی ارادے ہیں؟"

"ابھی ہوا ہی کیا ہے؟"

"اور اگر اس نے اپنے باپ کو شکایت کر دی تو؟"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"وہ کیوں کر؟"

"لڑکیاں اپنے باپوں کو یہ باتیں نہیں بتایا کرتیں۔"

"اور اگر بتا دیں تو؟"

"پھر وہ لڑکی نہیں لڑکا ہوگی۔" کامران نے اطمینان سے کہا۔

"خدا تم کو سمجھے۔"

"تجھے بھی۔"

"مجھے کیوں؟"

"میرا ساتھ کیوں نہیں دیتے ہو؟"

"الحمد للہ!" نعیم پورے کا پورا پیکٹ منہ میں خالی کرتے ہوئے بولا۔

"انا للہ!" کامران اس کے منہ پر تھپکتے ہوئے چیخا۔

"صاحب، آپکا فون ہے۔" آفس پہنچتے ہی اسکے اسٹینو نے بتایا۔

"ہیلو، ڈی بی صاحب ہیں؟" ایک بے حد نازک نسوانی آواز اس کی

سماعت سے ٹکرائی۔

یہ مس فصیح احمد کی بھتیجی جس نے اُسے بتایا۔

"جی بول رہا ہوں۔" وہ اچانک ہی بھاری سی آواز میں بولا۔

"انکل میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شانی فصیح احمد بول رہی ہوں۔" یکدم ہی اس کا لب و لہجہ اس طرح بدل گیا۔ جیسے وہ واقعی اپنے کسی بزرگ سے مخاطب ہو اور ہوتا بھی یہی۔ اگر واقعی ڈی ایس پی اتنی ہی عمر کا ہوتا کامران جتنی عمر کا لڑکا اُس کا بیٹا ہوتا تو۔ فصیح احمد گھر میں ہوتے۔ وہ ان کا آفس میں پڑوس اور اچھے تعلقات ہوتے تو وہ انکل ہی کہلاتا اس وقت۔

"اوہ ۔ اچھا ۔ اچھا۔" وہ بھی انکل ہی بن گیا۔ موٹی سی آواز میں سر ہلا ہلا کر بولا۔

"انکل! وہ دراصل ۔ ۔ ۔"

"ہاں ہاں بتائیے بتائیے۔" وہ ہنسی ضبط کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"وہ ۔ ۔ ۔ انکل ۔ ۔ ۔ ۔" وہ پھر جھجک کر خاموش ہو گئی۔

"بیٹے کیا بات ہے؟ بے تکلف بتا دیں۔" اُس نے حوصلہ دیا۔

"وہ انکل ۔ ۔ ۔ آپ بُرا تو نہیں مانیں گے؟"

"اوہ ہرگز نہیں۔ بالکل نہیں۔" وہ سمجھ گیا وہ کیا کہنے والی تھی؟

"وہ ۔ ۔ ۔ وہ ۔ آپکا بیٹا تنگ کرتا ہے انکل ۔ ۔ آئے ایم سوری آپکو

سن کر تکلیف ہوگی لیکن ۔ ۔ ۔ وہ بہت دنوں سے تنگ کر رہا ہے جی
میرا بار بار جیب کر گئی ۔ مگر اب سوچا آپ کو بتا دوں ۔ آپ ضرور میری مدد کریں گے۔
خاص کر ایسے وقت میں جبکہ بابا جان بھی گھر پر نہیں ہیں "۔
"خبیث کہیں کا ۔ نالائق ۔ آج میں اس کی وہ خبر لوں گا کہ یاد رکھے گا
نااہل پڑوس میں ایسی حرکتیں کرتے شرم نہ آئی اسے ۔ بس بیٹے! آپ فکر نہ
کریں ۔ چمڑی ادھیڑ کے رکھ دوں گا ۔ مجھے افسوس ہے بیٹے ۔ ۔ ۔ مجھے "۔
" ایم ریلی ویری سوری انکل ۔ ۔ ۔ میں آپ کو نہ ہی بتاتی تو اچھا تھا ۔
اچھا اچھا
باپ ! اور اتنا برا بیٹا ؟ ؟ ۔
آپ نے بہت اچھا کیا بتا دیا ۔ بھلا کیسے نہ بتاتیں ۔ کوئی بھی بات ہو
بے تکلف بتا دیا کریں ۔ شیخ احمد صاحب یہاں نہیں ہیں تو یہ نہ سمجھیں آپ
اکیلی ہیں ۔ کسی قسم کی فکر نہ کریں "۔
" سو نائس آف یو انکل ۔ تھینک یو انکل ۔ "
" اور کوئی خدمت بیٹے ؟ "
" شکریہ انکل ۔ میرے ذہن پر بڑا بوجھ تھا ۔ آپ سے باتیں ہو گئیں
ہلکا ہو گیا ۔ کل ۔ بابا جان سے فون پر بھی آپ کی باتیں ہوئیں ۔ ۔ ۔ "
" بھلا کیا بیٹے ؟ "

"بس یوں ہی انکل۔ بابا جان پوچھتے تھے ہم نے آپ کی دعوت کی یا نہیں؟ دراصل وہ جب یہاں ہوتے ہیں تو خود ہی ڈنر کسی کو اپنے یہاں انوائیٹ کرتے ہیں۔

"اچھا اچھا ...."

"عدیل پوچھتے تھے کیسے ہیں؟ میں نے کہا اچھے ہیں ...."

"آپ کو بھلا کیسے معلوم ہوا بیٹے کہ ہم اچھے ہیں"۔

"اوہ! انکل! آپ ضرور اچھے ہیں۔ لوگوں سے جیسا سنا تھا اس سے کہیں بڑھ کر ـــ اچھے ہیں آپ ...."۔ دنوں بعد اسے کسی مشفق ہستی سے باتیں کرنے کا موقع ملا تھا۔ باباجان کی غیر موجودگی کا ردِعمل تھا شاید کہ وہ کسی بزرگ کی مشفقانہ گفتگو سُن کر نہال ہوئی جا رہی تھی۔

"اوہ! شکریہ بیٹے ...."

"اچھا انکل! خدا حافظ"۔

"خدا حافظ"۔ اُس نے فون بند کیا۔

اِدھر اُدھر دیکھا کوئی بھی نہیں تھا۔ قدرے کنکھار کر وہ سنبھلا۔ اور اپنے سامنے کھلی فائل پر جھک آیا۔

"آداب انکل" نعیم بالکل پیچھے سے اُس کے کان میں بولا۔

اور کامران جیسے اُچھل کر رہ گیا۔

"تو تم ہو؟" انسپکٹر نے گہری سانس لی۔

"جی انکل"۔

"اور سب کچھ سن بھی لیا؟"

"جی بالکل انکل"۔

"اس وقت کی گفتگو بھی؟"

"ضرور انکل"۔

"تو پھر بیٹھو انکل" انسپکٹر نے سامنے کی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔
مگر نعیم بیٹھنے کے بجائے بیوقوفوں کی طرح منہ اٹھا کر اسے اچھا پھٹا
بیٹھا کر کامران سے بھی مزید ضبط نہ ہو سکا۔

اور پھر وہ قہقہے گونجے وہ قہقہے — کہ پاس والے کمرے میں بیٹھے
چپڑاسی تک چونک اٹھے۔

"کیسے تو تھے بالکل"۔

کامران نے ہنسی سے ہنس دیا۔

"میری موجودگی کا احساس تک نہ ہوا۔ جبکہ بالکل کان لگا کر میں سب
سن رہا تھا"۔

وہ پھر ہنس دیا۔

"اور تمہیں شرم نہ آئی۔"

"کیوں؟"۔

"تم سے بیٹی بیٹی کہہ رہے تھے۔"

"اگر غور کیا ہو تم نے تو میں نے بیٹی نہیں بیٹے کہا تھا۔"

"یعنی نکاح ٹوٹنے کا امکان نہیں"۔

"بالکل نہیں"۔

"تو یہ بات ہے؟"۔ نعیم شرارت سے بولا۔

"پھر شروع ہو گئے؟"۔

"شروع کیا۔ ہوگا بالکل ایسا ہی۔"

"یعنی؟"

"آجکل تم یقیناً اُسے پسند کرنے لگے ہو"۔

"ایسا دن نہیں آئیگا۔ تم فکر نہ کرو۔ اور سدھارو یونیورسٹی"۔

"ہاں وہی تو بتانے آیا تھا۔ آج میں دیر سے آؤں گا۔"

"کیوں جناب؟"

"ضروری نوٹس لکھنے ہیں"۔

"او۔ کے"۔

"خدا حافظ انکل"۔ وہ مڑتے چلتے گویا ہوا۔

"خدا حافظ"۔۔۔ اُس نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔

آفس سے چھٹی ہوتے ہی وہ گھر گیا۔ کھانا کھایا۔ خوب سویا۔ اٹھ کر گرم پانی سے نہایا۔ تیار ہو کر ایک کپ گرم گرم کوفی پی۔ اور اندرونی برآمدے میں نکل آیا۔ سامنے نظریں پڑیں۔ مس فصیح احمد نہیں تھی۔ جبکہ ہر شام وہ فرنٹ ریسٹر لیس پر موجود ہوا کرتی تھی۔

برآمدے سے ہوتا وہ سیب کے باغ میں جا نکلا۔ موسم آج بھی خوبصورت تھا۔ پہلے سے کہیں زیادہ حسین۔ سیاہ گھٹائیں آج بھی امڈ آئی تھیں۔ بے کلبہ ہوا درختوں میں سرسرا رہی تھی۔ وقت سے پہلے ہی جیسے ہر چیز دھند میں لپٹی نظر آ رہی تھی۔۔

پہاڑی پر کی چوٹی سے ہوتا آج وہ پائن آزر نے تکا۔ تبھی اس کی نظر دائیں طرف پڑی۔ یہ فصیح احمد کی کوٹھی کا سامنے کا حصہ تھا۔ جو اس نے آج سے قبل نہیں دیکھا تھا۔ بڑا وسیع خوبصورت لان تھا۔ دیدہ زیب پھولوں کے تختے تھے۔ اور بے انتہا خوبصورت محل نما کوٹھی دور تک پھیلی نظر آ رہی تھی۔

اچانک اس نے دیکھا۔ مس فصیح احمد نیوی بلیو رنگ کا بے حد سمارٹ ڈریس پہنے۔ بالوں کو سادگی سے پن اپ کئے اکیلی اور پیدل ہی اپنے گیٹ سے باہر نکل رہی تھی۔ چند لمحے یوں ہی کھڑا وہ اسے جاتے دیکھتا رہا۔ پھر جیسے یکدم ہی کچھ خیال آیا۔۔۔

آنکھوں کی چمک تیز ہو گئی۔ اور خوبصورت لبوں پر شریر مسکان بکھر گئی۔

وہ تیزی سے چوٹی پر سے مڑتا واپس نیچے آترا۔ کمرے میں گیا۔
شوز بدلے۔ اور جن کپڑوں میں تھا انہی میں باہر کی طرف لپکا۔
نعیم کا سکوٹر مرمت سے واپس آیا تھا۔ رکھا تھا۔ پیڈل مارا۔
اور گیٹ سے نکلتے ہوئے جیسے ہوا سے باتیں کرتے ہوئے سڑک پر
دوڑتا چلا گیا۔ اور پھر لمحوں میں ہی اس نے مس نصیح احمد کو جا لیا۔
متوازن چال چلتی وہ ابھی اپنے گھر کے قریب ہی سڑک پر بائیں
طرف چلی جا رہی تھی۔ سکوٹر تیزی سے دوڑاتا وہ اس سے آگے نکل گیا۔
اور پھر اچانک ہی واپس لوٹ کر اس کے بالکل قریب آتے ہوئے کچھ
ایسا جھٹکا کھایا۔ کہ سکوٹر سمیت عین اس کے قدموں میں آگرا۔ وہ۔
گرتے گرتے بھی بمشکل اپنا توازن برقرار رکھتے ہوئے سرعت
سے ایک طرف ہٹ گئی۔ پہلے تو کچھ سمجھ ہی نہ سکی۔ یہ جسے ... یہ تھا
کون؟ قدرے حواس درست ہوئے اور اس کی شکل دیکھی۔ تو وہ
معاملے کی نوعیت سمجھ گئی۔
یہ اچانک حادثہ نہ تھا۔ سوچی سمجھی سکیم تھی۔
"اُف میرا پاؤں" وہ اچانک پڑے پڑے اپنا پاؤں پکڑتے ہوئے
کراہا۔
اس کی کراہ میں کرب تھا، تکلیف تھی۔ اس کی سوچ غلط بھی تو

ہوسکتی تھی۔ وہ سچ مچ بھی تو گر سکتا تھا۔ ایک پل کو وہ وہیں کھڑی رہ گئی۔

"اوہ۔ پروردگار۔۔۔۔" وہ پھر درد سے تڑپا۔

جانے کیا بات تھی؟ وہ آگے بڑھنا چاہتی تھی۔ مگر قدم رک سے جاتے تھے۔ کچھ بھی تھا۔ کیسا بھی تھا؟ پھر ان کا پڑوسی تھا۔ اور پھر آج ہی ان سے بات ہوئی تھی۔ بہت شفیق ہستی تھی ان کی۔ یہ ان ہی کا تو بیٹا تھا۔ اس وقت اس کی مدد کرنا اس کا اخلاقی فرض تھا۔ وہ۔۔
کچھ جھجکتے ہوئے اس کے قریب چلی آئی۔

"ہائے"۔ وہ پھر چیخا۔

"پاؤں میں چوٹ آئی ہے؟" پچھلی رنجشیں بھول کر وہ جھجکتے ہوئے اس کے پاؤں پہ جھک آئی۔

"ہاں"۔ اس کی آنکھوں تک میں تکلیف ابھر آئی تھی۔

"اوہ۔ میں ابھی بلاتی ہوں کسی کو"۔ وہ ہمدردی سے بولی۔ "آپ کو ہوسپٹل لے جانا چاہیے۔"

"ہائے"۔۔۔

"پلیز حوصلہ کیجئے۔ بس ابھی ہمارا ڈرائیور آپ کو ہوسپٹل پہنچاتا ہے"
پھر اسے اچانک خیال آیا۔ "آپ کے فادر بھی تو گھر پہ ہوں گے۔ انہیں بھی اطلاع کرتی ہوں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ارے نہیں نہیں۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔ "آنچ بالکل نہ آئے گا جیجی ادھیڑ دیں گے۔ آج مجھے ڈانٹا بھی بہت ہے۔ آپ نے میری شکایت کی ہے نا۔" اس کا لہجہ بالکل معصوم بچے کا سا تھا۔ اور شانی کو نہ چاہتے ہوئے بھی ہنسی آگئی۔ "اچھا نہیں نہیں کہتی۔" اس نے آہستہ سے ہاتھ چھڑانا چاہا۔ مگر وہ چونکی۔ اس نے گرفت اچانک مضبوط کرلی تھی۔ اس نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔ "ہائے۔" اپنے پاؤں کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے اس نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتی قریب ہی اپنے گیٹ کی طرف بڑھی۔ اور کامران ادھر ادھر دیکھتا۔ اپنے کپڑے جھاڑتا اٹھ کھڑا ہوا۔ سکوٹر اٹھایا اس پر بیٹھا۔

"ٹاٹا۔" وہ ابھی اپنے گیٹ کے پاس ہی تھی۔ کہ زن سے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے آہستے "ٹاٹا" کہا۔ اور اس بار ردعمل دیکھے بغیر سیدھا اپنی کوٹھی کی طرف مڑ گیا۔

آج پھر وہ اس کا منہ چڑا کر چلا گیا تھا۔ شانی کا خون کھول کھول اٹھا۔ اسے سمجھ نہ آئی۔ وہ کیا کرے؟۔ اس کی شکایت بھی کر دی تھی۔ ڈانٹ بھی پڑ گئی تھی مگر ڈھیٹ اتنا تھا۔ ڈانٹ کا ذرا بھی اثر نہ ہوا تھا۔ پھر اسے خیال آیا۔ کیسے ہمدردی کے تحت وہ اس کے قریب چلی گئی تھی۔ پھر کیسے اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ "لوفر کہیں کا۔ خبیث۔ بدمعاش۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے کوٹھی کے اندر چلی گئی۔ وہ بھول ہی گئی۔ کہ اس نے قریبی مکان میں اپنی دوست حمیدہ کے گھر جانا تھا۔

تبھی شاید وہ ماما کو نہیں بتانا چاہتی تھی۔ "طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" ماما کچھ پریشان سی نظر آ رہی تھیں۔ "اوہ ماما! میں بالکل ٹھیک ہوں... جمو فیبر کو فون کیا ہے وہ خود آ رہی ہے۔"

"اچھا اچھا میں تو ڈر ہی گئی تھی۔" وہ قریبی کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولیں۔ "بیٹے! کاردار نے خط میں کیا لکھا ہے؟"

کل ان کے آبائی گاؤں سے کاردار کا خط آیا تھا۔ اسی کے متعلق ماما پوچھ رہی تھیں۔

"بہت کچھ لکھا ہے ماما۔ لمبی لمبی باتیں ہیں۔" وہ قدرے مسکرائی۔ "بعد میں بتاؤں گی۔ اس وقت سر کچھ بھاری ہو رہا ہے۔" وہ آنکھوں پہ بازو رکھے آہستہ بولی۔

اس وقت وہ باتوں کے موڈ میں نہیں تھی۔ وہ تو سوچنا چاہتی تھی۔ کوئی حل کوئی ترکیب۔ اس لوفر سے نجات حاصل کرنے کی۔ اس غنڈے سے پناہ پانے کی۔

"وہی تو میں دیکھ رہی ہوں دشمنوں کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی تم آرام کرو۔ میں نیچے جاتی ہوں۔ تمہارے لئے رات کھانے میں مچھلی فرائی کرنے کو کہا تھا۔ مصالحے میں خود لگاؤں گی جا کر۔" وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے کہتی گئیں۔

اور شانی اسی طرح لیٹی ادھیڑبن میں مصروف رہی۔

شام کے پانچ بج چکے تھے۔ بھیگا بھیگا سا موسم بے انتہا حسین ہو رہا تھا۔ سفید بنگلے سے بادل پورے آسمان کو گھیرے میں لیے ہوئے تھے۔ سبزہ زار پہاڑیوں کو ڈھانپے بادلوں میں تحلیل ہوتے نظر آ رہے تھے۔ مست خرام ہوا درختوں کے جھنڈوں میں سرسرا رہی تھی۔ سامنے پانی آبشار کی صورت میں چاندی کی طرح چمکتا مخصوص شور سے نیچے ندی میں ایک تسلسل سے گر رہا تھا۔

کل اس کی چھٹی تھی۔ کالج میں کام اگرچہ آج کل زیادہ ہوتا تھا۔ امتحان بالکل قریب تھے۔ مگر چھٹی کے باعث ذہن پر کا بوجھ قدرے کچھ ہلکا تھا۔

وہ اپنے کمرے میں کھڑکی کے پاس آرام چیئر پر نیم دراز تھی، وہ چاہتی تھی کہ ٹیرس پر جا کر موسم سے لطف اندوز ہو۔ ٹیرس بنایا ہی اس لیے گیا تھا۔ اس کی فرمائش پر۔ اسی کے لیے ہی۔ ماما بھی دو بار آکر اسے باہر جا کر بیٹھنے کی تاکید کر چکی تھیں۔ خود وہ آج پھر اس کی پسندیدہ مخصوص ڈش بنانے میں مصروف تھیں۔ اور پھر ایسے موسم میں کمرے میں مقید رہنا قدرت کی لازوال خوبصورتیوں کی توہین بھی تھی۔ مگر

کل کے حادثے کے بعد جانے کیوں؟ اس کا دل نہیں چاہتا تھا۔ کہ ٹیرس پر جا کر بیٹھے۔ اور پھر اس کا سامنا ہو۔ اس نے جب بھی اسے دیکھا تھا۔ مغرور سا کچھ گنگنا رہا تھا۔ مگر

آج کیا اچھا موڈ تھا۔ واک کرنے کا۔ غارت کر دیا کمبخت نے آ کر۔ وہ غصے میں بھری سوچتی گئی۔ کوئی حل بھی تو اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ باپ سے شکایت کر کے بھی دیکھ لیا تھا۔ بابا جان گھر پہ ہوتے تو یقیناً وہ یہ سب نہ کر پاتا۔ مگر بابا جان۔ اُن کے آنے میں تو ابھی پورے دو ماہ تھے۔ عمر کے تقاضے سے ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ سے وہ پہلے بھی دو چار ہو چکی تھی۔ مگر اُس کے تیور ہی دیکھ کر دوبارہ کسی نے جرأت نہیں کی تھی۔ اور یہ آدمی تو۔ جیسے ہاتھ دھو کر اُس کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ نہ ڈانٹ کا اثر ہوتا تھا۔ نہ دھمکی کارگر ہو رہی تھی۔

وہ پریشان سی بستر پر پڑی رہی۔ آج وہ ٹیرس پر بھی نہیں گئی۔ ٹیرس پر بیٹھ کر موسم اور ارد گرد کے مناظر سے لطف اٹھانا اس کا روزانہ کا معمول تھا۔ محبوب ترین مشغلہ تھا۔

"کیا بات ہے بیٹی؟" ماما اندر آئیں اُسے واپس آتے دیکھ کر دریافت کرنا ضروری سمجھا "تم گئی نہیں صوفیہ لیلیٰ کے گھر؟"۔

"بس یوں ہی ماما۔۔۔۔ جانے کیوں؟" وہ ماما کو نہ بتا سکی۔ پہلے دن اُنہیں یہ ضرور کہا تھا۔ کہ وہ اُسے اچھا نہیں لگتا۔ اور ماما کو اُسے منہ نہیں لگانا چاہیے۔ مگر اس کے بعد معلوم نہیں کیا بات تھی۔۔۔ وہ مزید ماما کو کچھ نہ بتا سکی۔ کیسے کہتی کہ وہ کن نظروں سے اُسے تکا کرتا ہے۔ کیسی کیسی معنی خیز نظریں ہوتی ہیں اُس کی؟۔ اور یہ کیسے کہہ دیتی کہ آج اُس نے اُس کا ہاتھ بھی پکڑ لیا تھا۔ شاید۔

یہ اپنی باتیں ہوتی ہیں۔ پرائیویٹ سی۔ جو کسی کو بتائی نہیں جا سکتیں۔ یہ بھی نہیں تھا کہ اس میں اس کی مرضی شامل تھی۔ بلکہ۔ یہ تو کچھ تنگی سی تھی اُس کی۔ اور

آج ۔ کیا لگا رہی تھی ؟ کہ وہ کچھ نہیں کرے گا ۔ نہ جانے کیوں ؟

وہ اُس سے اپنے خالف سی رہنے لگی تھی ۔ شروع شروع میں تو عجیب البتہ ۔ لیکن بعد میں

کچھ دن قبل سے ۔ وہ جب بھی اُسے دیکھتی گھبرا سی جاتی ۔ اگرچہ گھبرانے کی کوئی ایسی

بات نہ تھی ۔ وہ اُس سے ڈرتی تو نہیں تھی ۔ تاہم ایسی لگی گزری تھی ۔ کہ وہ اس کا کچھ

بگاڑ لیتا ۔ مگر پھر بھی جانے کیا تھا ؟

وہ بولڈ خاصا تھا ۔ حرکتیں بھی ایسی کرتا ۔ باتیں بھی ۔ کہ اُسے پتا نہیں چل سکتا

تھا ۔ کم از کم سزا نہیں دی جا سکتی تھی ۔ اُس کی

شخصیت ہی ایسی تھی شاید ۔ مدبر سی بارعب سی ۔ کتنا

تضاد تھا ۔ اُس کی حرکتوں میں ۔ اور اُس کی شخصیت میں ۔

بی اے میں مسلسل فیل ہو رہا تھا ۔ عین لوفروں والی حرکتیں کرتا تھا ۔ مگر پھر بھی ۔ اگر

منہ سے چپ رہے ۔ یا نظر پاؤں نہ ہلائے ۔ تو شخصیت ضرور متاثر کن تھی ۔

"تم اُس کی شخصیت سے متاثر نظر آتی ہو ۔" کل ہی صوفیہ مجھ سے شریرانہ انداز میں کہہ رہی تھی ۔

"اوہ ۔ پلیز صوفیہ ۔ میں نے صرف بات کی ہے ایک حقیقت کہی ہے ۔ اس کے

علاوہ اور کچھ نہیں ہے ۔"

"ایسی لوفروں والی حرکتوں اور غنڈوں والی باتوں کے بعد وہ تمہیں بُرا ضرور لگنا

چاہیئے ۔"

"تو میں نے کب کہا ہے ۔ کہ وہ مجھے اچھا لگتا ہے ۔"

"تم کہتی ہو وہ بی اے میں مسلسل فیل ہو رہا ہے ۔"

"اور یہی میری کمزوری ہے ۔ میں ناکام انسان ایک لمحے کو بھی برداشت نہیں کر سکتی

"اس کا مطلب ہے وہ فیل نہ ہوتا رہتا تو تم اُسے برداشت کر لیتیں۔؟"

"شاید سوچ لیتی کچھ"۔ وہ شرارت سے بولی تھی۔

"اور اب؟"

"Never ever NO"۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا "تو تمہارے لئے کوئی ایسا لڑکا ہونا چاہئے جو فیل کبھی نہ ہوا ہو۔"

"اوّل تو میں نے اس پہلو پہ کبھی سوچا نہیں۔ لیکن اگر کبھی سوچنے کا اتفاق ہوا بھی۔ تو۔ یہ میری پہلی شرط ہوگی۔" اس نے سچائی سے کہا تھا۔

"تو اس بار اُسے نقل وتل دلا دو پاس ہو جائے گا۔"

"اب گاڑی نکل چکی ہے۔ میری کتاب میں فیل ہونا لکھا ہی نہیں۔"

"ہیئر ہیئر" صوفیہ نے تالی بجائی تھی۔

"پھر اس بیچارے کا کیا بنے گا۔؟" تھوڑے توقف کے بعد وہ پھر بولی تھی۔

"میں نے تمہیں اُس کی عجیب و غریب حرکتیں بتائی ہیں۔ کوئی سفارش نہیں بابا۔"

"تو پھر اتنے لمبے چوڑے تمہید کا مطلب؟"

"بھئی پڑوس میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ یا تمہاری دوست پہ جو بیت رہی ہے بس تفصیل ہی بتائی ہے۔ آگے کیا ہوگا؟ تمہیں دبلا ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"یعنی کہ دبلا ہونا تمہارے ذمّے"۔

"بس پلیز صوفیہ! اب مذاق ختم۔ اُس کی حرکتیں تو فرود والی ہیں۔ اور اس کی شخصیت اُس کے حرکات کی تردید کرتی ہے۔ میں یہی کہنا چاہتی تھی اور بس۔"

"ہو سکتا ہے اُس کی یہ حرکتیں غیر ارادی ہوں۔ تمہیں دیکھ لیا تو سٹپٹا گیا ہی

عقل کھو دیتا ہے صوفیہ کہنے لگی "وہ تمہیں پسند کرتا ہے اور اسی وجہ سے بے بس کر
رہا ہے"۔

"کیا کہنے ہیں پسند کے بھی۔ اگر ایسا ہی ہے تو کوئی معقول طریقہ اختیار نہیں
کرسکتا؟ کوئی [illegible] طریقہ؟ — وہ تو بعض اوقات ایسی نظروں سے دیکھتا
ہے کہ بس۔ بالکل تھرڈ کلاس عاشقوں کی طرح۔ اور پھر فیل شدہ عاشق کی ہی
تا کہ فیل نہیں۔ یہ بحث اب ادھر ہی ختم ہو جانا چاہیے"۔

"فیل ہو گیا تو کیا ہوا؟ کتنے ہی لوگ فیل ہوتے ہیں۔ پھر آخر کار پاس ہو کر اچھی
پوسٹ پر لگ جاتے ہیں۔ بعد میں کون پوچھتا ہے کہ پڑھائی کے دوران کیا حال تھا؟
دیکھا تو اس کی ظاہری پوزیشن کو ہی جاتا ہے"۔

"مجھے اچھی پوسٹ اور ظاہری پوزیشن نہیں چاہیے۔ ایک [illegible]
انسان چاہیے اور بس"۔

"تو یہ بیچارہ مفت میں ہاتھ پیر توڑ رہا ہے؟"

"یقیناً" وہ کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔

لیکن — اس کے باوجود وہ اس سے خائف تھی۔ اسے یہ بھی یقین نہیں تھا
کہ وہ اسے پسند کرتا ہے۔ پھر یہ حرکتیں؟ — معنی خیز نظریں؟؟ — سب کیا تھا؟
مذاق شاید — تو کیا وہ اس قابل تھی کہ اس کے ساتھ مذاق کیا جائے؟ اس کا
مطلب تھا۔ وہ کچھ سمجھتا تھا اپنے آپ کو اہم چیز غالباً۔

"ہونہہ" — وہ بڑبڑاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ "[illegible] کیا جیتا ہوگا تو اپنے لئے۔"
یوں چھپ کر بیٹھ جانا اسے اپنی شکست معلوم ہوئی۔ اٹھ کر اس نے منہ ہاتھ

"خبر ہے مجھ کو ہے پیار تجھ کو"

اوہ... آج کس انوکھے طریقے سے آتش نے اسے ان چھیڑا تھا کہ "نرجس"

مانو نہ پائے "رفتن" والی بات ہو رہی تھی۔

گانے کے بول پھر بدل گئے تھے۔

"الفت نہ سہی نفرت ہی سہی، اس کو بھی محبت کہتے ہیں"

"لاکھ چھپائے بھید مگر ہم دل میں سمائے رہتے ہیں"

تو آتش نے مختلف گانوں کے چیدہ چیدہ بول شیپ کرائے تھے؟ وہ انجان

سی بنی اس کی طرف پیٹھ کئے سامنے سیب کے درختوں پر نظریں جمائے کھڑی رہی۔

اندر واپس جا کر اپنی شکست مان لینا اسے کسی طور منظور نہ تھا۔

"کھلی بانہوں میں تجھ کو نہ ملک میں چاہیے۔ کہنا بھی مشکل، رہنا بھی مشکل"

جانے کیوں؟ آتش کی اس اوٹ پٹانگ حرکت پر اسے ہنسی آنے لگی۔ وہ

یقیناً ان بولوں کے ساتھ بھی ایکٹنگ کر رہا تھا۔ وہ دیکھ تو نہیں رہی تھی مگر

اس سے یہ امید ضرور رکھتی تھی۔

"میرے پاؤں میں گھنگھرو بندھا دے

تو پھر میری چال دیکھ لے"

اچانک ہی سپیڈ پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی۔ اور اس کا رخ غیر ارادی

طور پر اس کی طرف پھر گیا۔

"اوہ..." وہ اپنی ہنسی پر قابو نہ پا سکی۔

کمر میں کس کر سکارف باندھے وہ بڑے زور سے ٹھمکا لگا رہا تھا۔

اسے یہ کھیل خاصا دلچسپ معلوم ہوا۔ انجمن نے رخ اس کی طرف کر کے
وہ اسے دیکھنے لگی۔ وہ اس کا کیا بگاڑ رہا تھا؟ خود ہی کٹھ پتلی بنا ہوا تھا۔
"میں تیرے پیار میں کیا کیا نہ بنا دلبر۔ جا رے جا۔ یہ موسم نہ جانے یہ موسم" اب
پھر وہ اس کی طرف اشارے کر رہا تھا۔

"تیرے بھی دل میں آگ۔ آ گئی بے جا لگ۔ زبان سے چاہے نہ کر اقرار" اس
نے قریب بند ہوتے ریکارڈ کو اس طرح سنبھالا کر بینچ کے ساتھ سر ہلایا گر گیا
ویسپ نے اپنے گھوڑے کو سنبھالتے ہوئے رفیع کا ساتھ دیا ہوگا۔

"خدایا کیا چیز ہے یہ آدمی بھی"۔ اسے پھر ہنسی کا دورہ پڑا۔

"ہم تم ایک کمرے میں بند ہوں۔ اور چابی کھو جائے"۔ اس کی ایکٹنگ
اتنی عجیب تھی۔ اور نظریں۔

اتنی معنی خیز کہ وہ ساری ہنسی بھول بھال گئی۔ وہ پھر سے جلدی کمرے کی
طرف بڑھی۔

بول پھر بدل گئے تھے۔ کمرے میں آ کر وہ آرام چیئر پر ڈھیر ہو گئی۔

"کیوں ہم سے خفا ہو گئے اے جانِ تمنا۔
بھیگے ہوئے موسم کا مزہ کیوں نہیں لیتے؟"

ٹیپ سے گانے کی آواز آنے لگی۔ پھر
یکلخت ہی جیسے سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ کھلی کھڑکی میں سے اس نے دیکھا۔
ٹیپ ریکارڈر ہاتھ میں لئے کوٹ کندھے پر لٹکائے وہ اپنے برآمدے کی طرف
جا رہا تھا۔

اس نے ایک گہری تھکی سی سانس لی۔ کیسے کیسے بول اس نے ٹیپ کرائے تھے؟
یقیناً اسی کی خاطر یہ ساری تگ و دو کی تھی۔ پھر وہ اس عجیب سے اتفاق پر حیران بھی
ہوئی۔ مگر اس نے کمو کو بھی چپ رکھی تھی۔ اور اس کا پہلا گانا بھی یہی تھا۔ پھر وہ مڑ
کرآنے لگی تھی۔ تو بھی گانا اس کے حسب حال تھا۔ باقی تو خیر
نہ چاہتے ہوئے بھی وہ پھر ہنس دی۔ کیسی عجیب عجیب مضحکہ خیز حرکتیں کرتا
تھا یہ آدمی۔
چند دن قبل ہی اس نے اسے کمو پہنے دیکھا تھا۔ اس کے بعد ہی شاید
یہ گانا ٹیپ کرایا تھا۔
شانی کو یہ سب اچھا نہیں لگا تھا۔ مگر اس کی اوٹ پٹانگ حرکتوں پر اب بھی
ہنسی آ رہی تھی۔
پھر دوبارہ وہ ٹیرس پر نہیں گئی۔ وہ جلدی سے پڑھ رہا تھا۔ اور وہ ــ
واقعی آہستہ آہستہ ہمت کھو رہی تھی۔ اس کا سامنا کرنے کی۔ وہ شام اس نے
P. G. Wode House کے JEEVES پڑھتے پڑھتے گزار دی۔
کھانا کھاتے ہی وہ بستر پر دراز ہوگئی۔ آج اس کا سونے کا موڈ ہو
رہا تھا۔ کل چھٹی تھی۔ چاہتی تھی جلدی سو جائے۔ اور صبح دیر تک سوتی رہے۔
کالج میں بھی آج بہت تھک گئی تھی۔ بریک کے بعد کوئی کلاس نہیں ہوئی تھی۔
اور وہ تمام وقت ٹینس کھیلتی رہی تھی۔ ٹانگیں تھک کر چور ہو گئی تھیں۔
لائٹ آف کرتے ہوئے وہ نرم و گرم بستر میں گھس گئی۔ اور منٹوں میں ہی
نیند نے آ لیا۔

"ٹرن۔۔۔ ٹرن ٹرن"۔ یکبارگی سرہانے رکھے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

لاؤنج کے پچھلے حصّے میں بابا جان کا ٹیلیفون سیٹ ہوتا تھا۔ وہ ان ہی کے لیے مخصوص تھا۔ اس کے سٹے اور باقی پرائیویٹ کاموں کے لیے بابا جان نے اس کو ایک سیٹ لگوا دیا تھا۔ جسے وہ اپنے ہی بیڈروم میں رکھا کرتی تھی۔ "ہیلو مس خان سپیکنگ" وہ نیند سے بوجھل آواز میں بولی۔ "اوہ آپ سو رہی تھیں؟" کسی مردانہ آواز نے نہایت رومانٹک انداز میں آہستہ سے دریافت کیا۔

"کس سے بات کرنی ہے؟" وہ تند لہجے میں بولی۔

"آپ سے"۔ لہجہ حسبِ سابق آہستہ اور مزید رومانوی ہو گیا۔

"کیا نام ہے؟"

"کچھ نہیں"۔ اُسی لہجے میں جواب ملا۔

"تو بند کریں"۔ ساتھ ہی اس نے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔

جانے کم بخت کون ہے؟ ذرا نمبر ہاتھ لگ جاتے اور عورت کی آواز سنائی دے جائے بس پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ وہ دل ہی دل میں اسے کوستی پھر سے نرم لحاف میں گھس گئی۔

تھوڑی دیر وہ نیند کی کوشش میں کروٹیں بدلتی رہی۔ مگر جلدی ہی آنکھ لگ گئی۔

"ٹرن ٹرن"۔ وہ گھبرا کر جاگ اٹھی۔

ریسیور اٹھایا۔

"ہیلو"

"آپ جاگ رہی ہیں ابھی تک؟" وہی عاشقانہ مدھم آواز ابھری۔

"شٹ اپ"۔ اس نے فون بند کر دیا۔

ابھی لیٹ کر لحاف اپنے اوپر ٹھیک کیا ہی تھا کہ پھر گھنٹی بج اٹھی۔

"STUPID" وہ بڑبڑاتی ہوئی پھر بستر میں بیٹھ گئی۔

ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔ بالکل خاموشی سے بولی کچھ نہیں۔

"ہیلو"۔ وہی آواز آئی۔ بہت آہستہ سے۔

وہ خاموش رہی اب بھی۔

"ہیلو۔ بات کیجئے نا"۔

"ہیلو۔ دیکھئے آپ کی سانس کی آواز مجھ تک آ رہی ہے۔ اور آپ نہیں بول رہیں"۔

ثنائی کو سخت کراہت آئی۔ مگر جواب اب بھی نہیں دیا۔

"ہیلو"۔ اسی آواز نے بالکل مدھم سی سرگوشی کی۔

اور اس کا دل چاہا۔ وہ سامنے ہو۔ اور وہ اس کا منہ نوچ لے۔

"ہیلو۔ مجھے پہچانا آپ نے؟" وہ چونک اٹھی۔

وہ پہلی بار نارمل آواز میں بولا تھا۔ اور اس کی آواز کچھ جانی پہچانی سی تھی۔

مگر وہ اب بھی چپ رہی۔

"ہیلو۔ بات کیجئے نا۔ ناراض ہیں کیا۔ میں تو آپ کے لئے کیسے کیسے کھیلتا رہتا ہوں۔ اور آپ ہیں کہ سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتیں"۔

"اوہ۔ تو آپ ہیں"۔ اس کے منہ سے نکلا۔

اور ساختہ ہی اُس نے ریسیور کریڈل پر رکھدیا۔

اس کے بعد ہی رِنگ ہوتے۔ مگر اُس نے ریسیو نہ کیے۔ رات ساڑھے بارہ بجے تک یہی سلسلہ جاری رہا۔ تنگ آکر اُس نے پلگ ہی نکال دیا۔

اور پھر بہروں اُسے نیند نہ آئی۔ پر ایک بات ضرور تھی۔ شروع میں جب اُسے معلوم نہیں تھا کہ وہ کون ہے؟ وہ غصّے سے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ اس سے کچھ عرصہ قبل بھی کوئی بار بار فون کرکے اُسے تنگ کیا کرتا تھا۔ اُسے بھی اُس نے کھرے جواب دیے تھے۔ اور پھر اُس نے واقعی دوبارہ ایسا کرنے کی جرأت نہیں کی تھی۔

آج عرصہ بعد ایسا ہوا تھا۔ پھر اس کا خون کھولنے لگا تھا۔

مگر جوں ہی اُسے معلوم ہوا۔ یہ ڈیڈی ہی کا بھتیجا ہے اس کا غصّہ جاتا رہا تھا۔ بلکہ جانے کیوں؟ اُسے تو یہی اُس کی اوٹ پٹانگ حرکتوں میں سے ایک لگی تھی۔۔۔ ساتھ میں کچھ اطمینان سا بھی ہوا کہ وہ کوئی اور نہیں تھا۔ بہرحال اس کا پرفونی تھا۔ جو تنگ تو ضرور کرتا تھا۔ مگر تھا بے ضرر قسم کا۔ پھر

وہ دھیرے سے مسکرا دی۔ اگر وہ اُسے کھرے جواب دے بھی دیتی۔ بلکہ دے بھی چکی تھی۔ تو اُسے کیا خاک اثر ہوتا تھا؟ وہ بھلا کسی دھمکی یا ڈانٹ کی پرواہ کرتا تھا؟ اُس کا

سراپا اُس کی نظروں میں گھوم گیا۔

لمبا قد۔ چوڑے شانے۔ مسحور کن شخصیت۔ کیسی زبردست Personality پائی تھی۔ اُسے لوگوں کی کہی ہوئی بات کہ شخصیت سے

ہی انسان کے کردار کا اندازہ ہوتا ہے۔ سراسر غلط تھی۔ اس کی شخصیت پر تو بڑے بڑے دھوکہ کھا سکتے تھے۔ ایسی DASHING PERSONALITY تو کم ہی لوگوں کے نصیب میں آئی ہوگی۔ سوچتی ہوئی وہ آخر کار سو ہی گئی۔

شاید یہ پہلا موقع تھا۔ کہ دل چاہتے ہوئے بھی وہ دو دن سے ٹیرس پر نہیں جا رہی تھی۔ اسے تو اس جگہ سے عشق تھا۔ شام کے وقت کسی اور جگہ بیٹھتی تو اسے بے چینی سی ہونے لگتی۔

برف پڑنے کی ابتدا ہو رہی تھی۔ تب ضرور مجبوری ہوتی اور وہ سردیوں کی منجمد شامیں اپنے کمرے میں بڑی بڑی جلتی ہوئی لکڑیوں کے آگے بیٹھ کر گزارا کرتی تھی۔ مگر ۔۔

آجکل اتنی بے حد حسین، رنگین، شامیں وہ کیونکر اندر کمرے ہی بند رہ کر گزار سکتی تھی؟ کوٹھی کے سامنے کی طرف تو لمبا سکون میسر تھا، نا ہی اطراف اتنے حسین تھے۔ پھر نوکر چاکر۔ آنے جانے والے لوگ ہوتے تھے۔ پپا بھی بالکل نہیں آتی تھی۔ مگر اس طرف ۔۔

وہ بھی تو اسے سکون سے بیٹھنے نہیں دے رہا تھا۔ ماما موجود ہوتیں تو پھر کچھ نسبتاً ٹھیک رہتا تھا۔ مگر ماما بھی ہر شام ضروری نہیں تھا کہ فارغ ہوں اور اس کا مکمل ساتھ دیں ۔۔

اُسے پچھلے دن یاد آگئے جب یہ ڈریس ابھی نہیں آیا تھا۔ کتنا سکون ہوتا تھا۔ اور اب۔

وہ محسوس کر رہی تھی، مگر اب۔ وہ مزید اس کا سامنا نہ کر سکے گی۔ وہ جو پہلے سے باہر ہو رہا تھا۔ اخلاق کے تمام حدود پھلانگنے پہ تلا نظر آ رہا تھا۔

آج تیسرا دن تھا اُسے کمرے میں نظر بند رہتے۔ جبرائیل نے صوفیہ کو فون کر کے بلا لیا۔ کچھ گپ شپ ہی ہو جاتی۔ اور پھر اس کے آنے تک وہ تیار ہونے لگی۔ سفید اور نیلے رنگ کا گرم جیکٹ سوٹ پہن کر اُس نے نیلے شفون کا دوپٹہ لیا۔ اور نیلا ہی پوری آستینوں کا سویٹر پہن لیا۔ نیلی جرابیں پہن کر سفید بوٹ پہنے۔ بالوں کی ڈھیلی سی چوٹی بنائی۔ تیار ہونے کے بعد لباس پہ یوڈی کلون کی سپرے کی۔ اور آرام چیئر پہ نیم دراز ہوتے ہوئے پاس رکھا رسالہ اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگی۔ آج جبرائیل کا ٹیرس پہ جا کر بیٹھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

"ہیلو شانی" صوفیہ اچانک ہی نمودار ہوئی۔

"ہیلو صوفیہ" وہ رسالہ رکھتے ہوئے خوش ہو کر بولی۔ "بور ہو رہی تھی اکیلی سوچا تمہیں بلا لوں۔ باتیں کریں گے۔ بوریت بھاگ جائے گی۔"

"ہاں میرا بھی دل چاہتا تھا تمہیں اپنا نیا لیدر سوٹ دکھاؤں سوچ ہی رہی تھی کہ آ چلوں۔" وہ اردگرد گھومتے ہوئے، شرارت سے اُسے سوٹ کے مختلف زاویے دکھاتے ہوئے بولی۔

"بیوٹیفل، بہت سمارٹ لگ رہی ہو اس میں۔"

"اب بتاؤ تم نہیں ۔ بتاؤ جلا کیوں تھا؟" وہ کھڑے کھڑے بولی ۔

"بتایا تو جو دیا اور بیدھ رہی تھی۔"

"اتنے زندہ دل پڑوسی ہوں ۔ اور لوگ بور ہو جائیں ۔ بس نہیں مانتی۔"

اور شانی اس کی بات پہ کھلکھلا کر ہنس دی ۔

"بتاؤ نا ٹھیک ٹھیک۔"

"بھئی تم آخر کہلوانا کیا چاہتی ہو ۔ کہہ تو دیا ہے بور ہو رہی تھی۔"

"یہ کافی نہیں ہے ۔ آؤ ٹیرس پہ جا کر بیٹھیں ۔ ماما سے کہو مزیدار سی چائے لائیں ۔
اور چائے پیتے پیتے میں تم سے مطلب کی بات اگلوا لوں گی۔"

"ٹیرس پہ بیٹھنا کیا ضروری ہے ۔ خالہ میں بیچ ہو رہی ہے ۔ یہیں بیٹھتے ہیں۔"

"تم تو کمال کرتی ہو ۔ بیچ منجمد کر دینے والی شامیں ہوں ۔ بادل ہوں ۔ اور تم ہو ۔
میں تو اب بھی یہی کہتی ہوں ۔" اسے تو عشق تھا ایسے ماحول سے ۔ اس کا
جی للچایا ۔ مگر ۔

"آج یہیں ٹھیک ہے۔" وہ پھر کترانے لگی ۔

"نہیں اور بالکل نہیں۔" وہ اسے ہاتھ سے پکڑتے ہوئے زبردستی ٹیرس
پہ کھینچ لائی ۔

آج خلافِ معمول آسمان صاف تھا ۔ ہوا خنک تھی ۔ سبزہ نکھرا ہوا ۔ پہاڑ
دُھلے دُھلے ۔ اور ندی کا پانی مغرب کی طرف جاتے سورج سے سونے کا رنگ
چرائے لیے جا رہا تھا ۔

دونوں لوہے کی تار کی سفید جھک کرسیوں پہ بیٹھ گئیں ۔ بہت دنوں کے

بعد سنہری دھوپ آنکھوں کو بھلی لگ رہی تھی۔

"تمہارا "وہ" نظر نہیں آ رہا"۔ اِدھر اُدھر کی چند باتوں کے بعد صوفیہ اپنے مطلب پر آئی۔

"تمہارا "وہ" ہو گا نا"۔

"میری ایسی قسمت کہاں؟"

"اب وہ ایسا بھی نہیں ہے کہ قسمت اُسے ڈھونڈتی پھرے"۔ احسن کا سراپا اُس کی نظروں میں گھوم گیا۔ اور اُسے اپنی بات میں کچھ غیر صداقت سی سی نظر آئی۔

"مگر وہ نظر نہیں آیا"۔ صوفیہ پھر بولی۔

"پلیز۔ نام نہ لو ورنہ شیطان کی طرح حاضر ہو جائے گا"۔

"تمہیں دیکھتے ہی نکل آتا ہو گا بل سے"۔

"بل سے نہیں نکلتا۔ وہ تو بہت دھوم دھڑکے سے نکل کر آتا ہے"۔ وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "ایسی ویسی معمولی چیز نہیں ہے"۔

"تو یہ بات ہے"۔ صوفیہ معنی خیز انداز میں بولی۔

"تم کچھ بھی کہو حقیقت اپنی جگہ ہے۔ کبھی دیکھو گی اپنی آنکھوں سے۔ میں نے اتنا لولا شخص آج تک نہیں دیکھا۔ باپ سے شکایت بھی کر دی۔ ڈانٹ بھی پڑی مگر اُسی شام وہیں کا وہیں تھا۔ بلکہ پہلے سے بھی بڑھ کر۔۔۔"

"اوہ۔ وہ دیکھو۔ وہ تو نہیں؟" صوفیہ اچانک ہی بالکل سامنے مرمریں برآمدے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"وہی ہوگا"۔ اس نے رُخ موڑے بغیر کہا۔ جگر۔
دل بلا شبہ بے ترتیب ہو کر دھڑک اٹھا۔
"مگر ایک ہاتھ میں پتنگ دوسرے میں ڈوری ہے۔ پیچھے پیچھے ایک اور بھی
لڑکا ہے"۔ صوفیہ کچھ حیرت سے بولی۔
"بس وہی ہے۔ وہ ہی آگے آگے رہتا ہے۔ دوسرا بیچارا تو بہت شریف ہے!
اپنے برآمدے سے کبھی ایک قدم بھی اس طرف نہیں بڑھایا۔ یہی آکھاڑ کو تیار رہتا
ہے۔ بس چلے تو ریلنگ ہی پھلانگ کر آجائے"۔ وہ پیچھے پیچھے بڑا آہستہ آہستہ کھسک گئی۔
خائف سی۔ سہمی سی۔ جانے کیا گل کھلانے والا تھا آج؟۔
"مگر ہے خاصا DASHING"۔ صوفیہ متاثر سی نظر آنے لگی۔
"پھر تو پیغام بھجوا دوں؟"۔
"نہیں نہیں نہیں ہی مبارک ہو۔ میں نے اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلا لیے
ہیں۔ میرے لیے اپنا ندیم ہی کافی ہے"۔ اس کی منگنی ہو چکی تھی۔ اور ندیم مقامی
بینک میں اسسٹنٹ مینیجر تھا۔
"اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے سے کیا مطلب؟" وہ ہنس دی۔
"یہی کہ میرے ساتھ ایک بینک کا اسسٹنٹ مینیجر ٹھیک لگتا ہے اور پیلے کے
ساتھ یہ"۔
"تو یہ کون سی آسمان سے اتری ہوئی مخلوق ہے؟"۔ وہ کچھ طنز سے بولی۔ جھک
جانے کیا بات تھی؟ کچھ دنوں سے وہ محسوس کر رہی تھی۔ کہ بی۔اے کی تکمیل
ہونے کے باوجود۔۔۔ لوفروں جیسی حرکتیں کرنے کے بعد بھی وہ ایک خاص قسم کی۔

زبردست PERSONALITY رکھتا تھا۔ ایسی کہ۔ جو—

ذرا سا متاثر کر لے۔ یہ اور بات تھی کہ وہ متاثر ہونے سے کترا رہی تھی۔

وہ بی اے میں فیل ہو رہا تھا۔ اور اسے ایسے لوگ جانے کیوں اچھے نہیں لگتے تھے، بلکہ یہ بات بھی نہیں تھی۔ اس کی کئی فرینڈز ایسی تھیں جو کہیں نہ کہیں فیل ہوتی تھیں مگر اسے ان سے پھر بھی بہت لگاؤ تھا۔ پھر کیا تھا؟ —

شاید اس کا آئیڈیل مرد اسے فیل ہوتا اچھا نہیں لگتا تھا۔ یا پھر دوسرے لفظوں میں اس کا آئیڈیل ایک لائق بلکہ BRILLIANT مرد تھا۔

یہ بھی شاید۔ اس لئے تھا کہ خود وہ بہت intelligent تھی۔ کے جی سے لے کر اس وقت تک اپنی کلاس میں فرسٹ آتی رہی تھی۔ سوائے ایک یا دو دفعہ کے۔ اور پھر بارہا اسے یاد ہے وہ بہت روتی تھی۔ اور بابا جان سے ڈانٹ الگ پڑی تھی۔ یہی وجہ تھی شاید۔ بہرحال۔

”آسمان سے اتری نہ سہی۔ پریشانی! قسم اٹھا کر کہو۔ اس کے بے انتہا ہینڈسم ہونے میں بھی تمہیں شک ہے؟“

”Handsome is that Handsome does“ اس نے دھیرے سے کہا۔

”وہ سب ایک طرف چھوڑو۔ تم میری بات کا جواب دو۔ کیا اس کی شخصیت بہت پرکشش نہیں ہے؟“ صوفیہ مسلسل اس پہ نظریں جمائے سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔

”ہوگی، میں نے غور نہیں کیا۔“ جبکہ

وہ اپنی غلط بیانی صاف محسوس کر رہی تھی۔ صوفیہ دیکھ رہی تھی کہ اس دوران اس نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر اسے نہیں دیکھا۔

"تو اس نے تو پتنگ اڑانا شروع کر دیا۔" صوفیہ مزید حیرت سے بول پڑی اور شانی کھلکھلا کر ہنس دی

"آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟ پتنگ اڑانا کوئی ایسی قابلِ گرفت حرکت تو نہیں"

اور صوفیہ اسے ہاتھ سے پکڑ کر پتنگ تک لاتے ہوئے دلچسپی سے سامنے دیکھنے لگی۔

آج اس کے ساتھ دوسرا لڑکا بھی پتنگ اڑا رہا تھا۔ مگر وہ دور بادام کے باغ والی پہاڑی کی چوٹی پر کھڑا تھا۔ اور یہ —

پیر لیس کے قریب سبزیوں کی کھیتیوں میں —

دونوں کے پتنگ ہواؤں کے دوش پر اوپر ہی اوپر اڑے جا رہے تھے دور سے تو پکارا جانے کچھ کہہ بھی رہا تھا یا نہیں۔ مگر اس کا شور واویلا شروع ہو گیا۔

"وہ مارا۔ وہ مارا۔" وہ بچوں کی طرح خوش ہو رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ دوسرے لڑکے کی پتنگ کو کاٹنے کی کوشش میں بھی لگا ہوا تھا۔ اگرچہ دوسرے کی بھی کوشش یہی تھی کہ اس کی پتنگ کاٹ گرائے مگر منہ سے بالکل خاموش تھا۔ شاید لیڈیز کی موجودگی ملحوظِ خاطر تھی۔ اور یہ؟ اسے کب کسی کی پرواہ تھی؟ ۔

پھر انکس نے وہ شور مچایا۔ وہ شور۔ کہ الامان۔ صوفیہ مارے ہنسی کے دوہری ہو رہی تھی۔ اور شانی بھی یقیناً محظوظ ہو رہی تھی۔ مگر ظاہر نہیں ہونے دے رہی تھی شاید۔ یا دوسرے لفظوں میں شکست کی قائل نہ تھی۔ کھیل کافی دلچسپ تھا۔ مگر طویل بھی۔ وہ صوفیہ کو لے کر سیڑھیاں اترتی پانی میں اتر گئی۔ دونوں چبوترے پر کھڑی دور جاتی ندی کو دیکھ رہی تھیں۔ تبھی۔

شانی شور سے چونکی۔

"وہ کاٹا۔ وہ کاٹا۔" سامنے ہی وہ سیڑھیاں اترتا نمودار ہوا۔ اس طرح۔

کہ نظریں کبھی اوپر آسمان کی طرف اپنی پتنگ پر اور کبھی نیچے سیڑھیوں پر تھیں۔ مگر آ وہ انہی کی طرف رہا تھا۔

وہ پھر گھبرا گئی۔ یہ اتفاق نہیں تھا۔ وہ خواہ مخواہ ہی۔ جان بوجھ کر ان کی طرف آیا تھا۔ "ذرا اور ذرا اور۔" وہ ڈوری کو جھٹکے دیتا ان کے پاس چوڑے چبوترے پر آ کھڑا ہوا۔ صوفیہ حیرت کی دلچسپی سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔ پھر انکس نے جیسے چونکتے ہوئے ایک نظر ان پر ڈالی۔

"ہیلو۔" انکس نے قدرے جھجکتے ہوئے بہت شائستگی سے صوفیہ کو "ہیلو" کہا۔

"ہیلو" صوفیہ مرعوب سی نظر آنے لگی۔

"اوہ آپ بھی ہیں۔" وہ پھر شوخ ہو گیا۔

شانی کی آنکھوں میں بھرپور نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ یوں بولا۔

جیسے ابھی ابھی انس کی موجودگی کا احساس ہوا ہو۔
اور وہ جز بز ہو کر رہ گئی۔

"پتنگ اڑائیں گی؟" انس نے زبردستی پتنگ کی ڈور اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے ایک ہاتھ سے اس کا دوسرا ہاتھ پکڑا اور دوسرے سے چرخی کی ڈوری پکڑ کر اڑانے لگا۔

صوفیہ ٹھٹکتے ہوئے قدرے پیچھے ہٹ گئی۔ خاصا دلچسپ آدمی تھا اس نے سوچا۔ شانی نے تو کچھ اور ہی تصویر اس کی پیش کی تھی۔ اس کے سامنے

"اڑائیے نا" ہاتھ میں پکڑا شانی کا ہاتھ زور سے دباتے ہوئے وہ بغور اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔

اور شانی جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا کر پیچھے ہٹ گئی۔ "ارے، کافی بد ذوق ہیں آپ تو" وہ پھر مصروف ہو گیا۔

"وہ کاٹا" وہ اچانک پیچھے ہٹتے ہوئے زور سے چلایا تھا۔

صوفیہ نے دیکھا انس نے واقعی دوسرے لڑکے کی پتنگ کاٹ دی تھی۔ مگر پھر —

بے اختیار اپنی ہنسی نہ روک سکی۔ پتنگ کاٹتے کاٹتے وہ اس زور سے پیچھے ہٹا تھا کہ شانی کو کچل جانے سے اور خود شانی سے جا ٹکرایا تھا۔ اور مزہ تو یہ تھا کہ خود اسی حالت میں کھڑا بے نیازی سے اپنی پتنگ کی ڈور لپیٹتا اور یہ آسمان سے گرتی کٹی ہوئی پتنگ کو دیکھ رہا تھا۔

صوفیہ نے ایک نظر شانی کو دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے آنسو پونچھ

جھنکیلی رہی تھی۔ جبکہ جواب میں وہ اتنی ہی قوت سے واپس اس پر گرا جا رہا تھا۔

صوفیہ اپنی بے بسی مزید برداشت نہ کر سکی۔ اور آگے بڑھ کر سیڑھیاں چڑھتی اوپر جانے لگی۔

"ہٹیے میرے آگے سے"۔ وہ سختی سے بولی۔

"وہ دیکھیے چلی آ رہی ہے پتنگ"۔ وہ ان سنی کرتے ہوئے پتنگ کی طرف اشارہ کرنے لگا۔

"میں کہتی ہوں آپ ہٹ جائیں میرے آگے سے"۔ ساتھ ہی وہ اسے پھر دھکیلنے لگی۔

"آپ کے ہاتھ بہت نازک ہیں"۔ وہ اب بھی نظریں پتنگ پر جمائے ہوئے تھا۔

"ہٹیے نا"۔ اس کے لہجے میں بے بسی عود کر آئی۔

کیسا انسان تھا یہ؟ اس کے ہاتھ تو واقعی بہت کمزور اور وہ درحقیقت بہت مضبوط تھا۔

کامران اس کے لہجے پر چونکا۔

"واقعی ہٹ جاؤں؟" یکدم سیدھا ہوتے ہوئے اس نے رخ اس کی طرف کر لیا۔

اور شانی اس کے ہٹتے ہی کوئی جواب دیئے بنا سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگی۔

"ناراض ہو گئی ہیں؟" اس کے سامنے آ کر اس کا راستہ روکتے ہوئے اس نے مزید پوچھا۔

شانی کی جھکی پلکیں اُٹھیں۔

"اوہ"۔ وہ گڑبڑا سا گیا۔ وہ اُس کا مقابلہ نہ کر پائی تھی اچھی شاہ

اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

"I am sorry" وہ پہلی بار تاسف سے بولا۔

"بابا جان آئیں گے تو میں سب بتا دوں گی"۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے

رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

اُس کی آواز میں شکست کی جھلک نمایاں تھی۔ وہ واقعی اس کا مقابلہ نہ

کر پائی تھی۔ اُس کا لہجہ اُس معصوم بچے کا سا ہو رہا تھا جو اپنے سے زیادہ

طاقت والے کا خود مقابلہ نہ کر سکنے کے بعد اپنے باپ کی دھمکی دینے لگا ہو۔

اُس کی ذات سے وہ اُسے دھمکا رہی تھی جیسے۔ خود تو جیسے ہار گئی تھی۔

"پلیز!" وہ بے چین سا ہو اُٹھا۔ "I am really sorry"

وہ اس کی دھمکی سے مرعوب نہیں ہوا تھا۔ اُسے واقعی افسوس ہوا تھا پہلی بار

جانے کیوں؟۔

اور وہ رخ موڑے بغیر کوئی جواب دیئے بنا اپنی سیڑھیاں چڑھتی گئی۔

کچھ دیر وہ اُسے جاتے دیکھتا رہا۔ پھر

چہرے پر گہرا تاسف لیے کچھ سوچتا ہوا وہ دھیرے دھیرے اپنی

سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

اور پھر رات کو اُسے نیند ہی نہ آئی۔ کروٹ پہ کروٹیں بدلتا رہا۔ جانے کیا بات تھی؟ اُس کی نم آنکھیں بار بار آتے ہی وہ بے چین سا ہو جاتا۔ آج اُس نے اُسے برا بھلا بھی نہیں کہا تھا۔ مشتعل بھی نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ پچھلے کئی دنوں سے وہ کچھ سہمی سہمی سی نظر آ رہی تھی۔ وہ غصہ و جلال اب نہیں رہا تھا۔ سکوٹر پر اُس کے قدموں میں جا کے گرا تھا۔ تو اس کا خیال تھا۔ اگلے دن اُسے ضرور کھری کھری سنائے گی۔ مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔

اُس نے گانے سنا سنا کر لفنگوں کی طرح اشارے کر کر کے تنگ کیا تھا۔ تب بھی وہ کچھ نہیں بولی تھی۔ پھر۔

آج ۔۔۔ تو اُس نے حد ہی کر دی تھی۔ اُس پر اپنا پورا بھدا بوجھ ڈالے انجان بنا کھڑا رہا تھا۔۔

شاید وہ تھک گئی تھی اُسے برا بھلا کہتے کہتے۔ یا پھر ڈھیٹ سمجھ کر خاموش ہو گئی تھی۔ مگر نہیں۔ یہ بھی نہیں تھا۔ اُس نے تو ۔۔۔ اُس نے تو ۔۔۔ جیسے سپر ڈال دیے تھے۔ اُس کے سامنے۔ ہار مان گئی تھی۔ جیسے اُس سے ۔۔۔

کامران کو بھی شاید اسی لیے افسوس ہو رہا تھا۔ اس وقت۔ کہ اُس کا جلال، اُس کا جذبہ ختم ہو گیا تھا۔ اُس نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ لوفر کہنے کا جو بدلہ وہ اُس سے لے رہا تھا۔ وہ پورا ہو گیا تھا شاید۔

وہ لاجواب ہوگئی تھی، اور خود اُس نے اپنی توہین کا بدلہ لے لیا تھا۔ تبھی شاید اُس کی آنکھیں نم۔ اور خود وہ پشیمان ہو رہا تھا۔

اُٹھ کر وہ بستر میں بیٹھ گیا۔ سرہانے رکھے جگ سے گلاس میں پانی انڈیلا۔ اور غٹاغٹ پی گیا۔ پھر لیٹ گیا۔

اُس کی بڑی بڑی خوبصورت شربتی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ واقعی بہت نازک تھی اور اُس نے اُس کے ساتھ درحقیقت بہت زیادتیاں کی تھیں۔

پے بہ پے دہ اپنی کی گئی زیادتیاں دہرانے لگا۔ کبھی اُسے ہنسی آجاتی اور کبھی اُسے افسوس ہوتا تھا۔ کیسی کیسی انجینگ کرتا تھا وہ روزانہ۔ اُف۔ وہ سخت حیران ہوا۔ کیسی کیسی حرکتیں کرتا تھا وہ۔ تہذیب سے گری ہوئی احمقانہ حرکتیں۔ اُسے واقعی افسوس ہو رہا تھا۔

یہ سب نہیں ہونا چاہیے تھا۔ پچھلے دو تین دن سے وہ میٹرس پر بھی نہیں آرہی تھی۔ اُسی سے نوخائف تھی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا۔

اُس نے کروٹ بدلی۔ جاگ جاگ کر اور سوچ سوچ کر اُس کے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر اُس نے سرہانے رکھا لیمپ آن کیا۔ گھڑی دیکھی چار بج رہے تھے۔ وہ بستر سے نکل آیا۔ کمرے کی بتی جلائی۔ روشنی ہوئی تو اُسے قدرے سکون کا احساس ہوا۔ پھر وہ باتھ روم چل دیا۔ پانچ بجے یوں ٹی سے پرواز ہونا تھا۔ تیار ہو کر اُس نے کمرے میں ہی ناشتہ منگوایا اور پورے پانچ بجے جیپ میں بیٹھ کر چل دیا۔

—وہ پانچ دن مختلف جلسوں کا دورہ کرتا رہا۔ تمام دن وہ مصروف رہتا

مگر رات بستر پر لیٹتے ہی اُسے وہی سوچیں آن گھیرتیں۔

ایک ایک کر کے گزرے واقعات۔ اپنی احمقانہ حرکتیں چھیڑ چھاڑ۔ اُس کا اشتعال بوکھلاہٹ۔ گھبراہٹ اور پھر آخرکار اُس کی بے بسی۔ آنکھوں میں جھلملاتے آنسو۔ آنکھیں جو بلاشبہ بہت خوبصورت تھیں۔

پھر اُسے پشیمانی کا شدید احساس ہوتا۔ اور اس کی نیند اڑ جاتی۔ وہ اُس سے واپس جا کر معافی مانگ لے گا۔ وہ سوچتا۔ اور تبھی ذہن پر کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جاتا۔

کل اُس کی واپسی تھی۔ رات پھر بستر پر لیٹا تو اُسی کے خیالوں نے گھیر لیا۔ پشیمانی بھی عجیب چیز ہے اُس نے سوچا۔ کسی کل چین تو اُسے چین لینے نہیں دے رہی تھی۔

ایک عجیب سی خلش تھی۔ انوکھی سی چبھن تھی۔ بے نام سی الجھن تھی جو اُسے بے چین کیے ہوئے تھی۔

شاید اس لیے کہ اس سے قبل اُس نے کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا تھا کبھی کسی کو پریشان نہیں کیا تھا۔ دل دکھانا یا پریشان کرنا تو یہاں بھی اس کا مقصد نہیں تھا۔ وہ

تو صرف اُسے تنگ کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے جو اُسے چھوٹتے ہی بیوقوف کہہ دیا تھا۔ وہ بھی بیوقوف بننے کی کوشش کرنے لگا تھا محض اُسے تنگ کرنے کی خاطر۔ ورنہ جو حرکتیں اُس نے کی تھیں۔ اُن کے متعلق تو کبھی وہ خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔ اوٹ پٹانگ۔ بعینہ بیوقوفوں والی حرکتیں۔

اُس کی طبیعت میں شوخی ضرور تھی۔ وہ ہنس مکھ اور خوش مزاج بھی یقیناً

تھا۔ مگر ساتھ ہی طبیعت پُر بُردباری تھی۔

اُس کی باتیں جہاں زندگی کا احساس دِلاتی تھیں۔ وہاں انداز گفتگو کا دھیما اور شائستہ پن اُسے دوسروں میں ممتاز رکھتا تھا۔

وہ یقیناً ویسا نہیں تھا جیسا اُس نے کر دکھایا تھا۔ بہرحال۔ وہ چاہتی تھی اُس سے معافی مانگ لیگا۔ سوچ کے اس نکتے پر آ کر وہ قدرے مطمئن ہو جاتا۔

کل اُس نے واپس جانا تھا۔ اُسے خوشی ہو رہی تھی۔ جانے کیوں؟ شاید اُس سے معافی مانگ کر ذہن کا بوجھ ہلکا ہو جانے کا خیال تھا۔ اس وقت بھی اُس کے مختلف روپ اُسے تصور میں نظر آ رہے تھے۔ کبھی ہنستے ہیں۔ کبھی حیرانگی میں۔ کبھی سٹپٹاہٹ میں۔ تو کبھی گھبراہٹ میں۔

وہ مسکرا دیا۔ دھیرے سے

واقعی وہ کیسے کیسے طریق سے تنگ کرتا آیا تھا اُسے۔ اس وقت پھر اُس کی نیند غائب ہو گئی۔ نیند تو اکثر ہی پچھلی کئی راتوں سے اُڑ جاتی تھی۔ مگر۔ آج کی کھلی آنکھوں میں تو کچھ عجیب سی کیفیت جھلک رہی تھی۔ بالکل انوکھی سی۔ کچھ خوشی کی کیفیت تھی۔ کچھ انتظار کی سی۔

تو صبح گھر واپس جانے کی اُسے اس قدر خوشی تھی؟ اتنا انتظار تھا؟ کیوں؟ یہ اس سے معافی مانگ کر ذہن کا بوجھ ہلکا ہونے کے خیال سے؟۔

کیا وہ اتنی ہی اہم تھی؟۔ کہ اُس سے معافی مانگ لینے۔ دوسرے لفظوں میں اُسے منا لینے کے خیال سے اُسے خوشی ہو رہی تھی؟۔ اور گھر جانے کا

کا اس قدر منتظر بھی صرف اسی لئے تھا؟ ۔ اس نے اپنے آپ سے سوال کیا ؟ بات تو یقیناً یہی تھی مگر ۔

خوشی کا یہ انداز ؟ ۔

انتظار کی یہ شدت ؟؟ ۔

باوجود کوشش کے وہ کوئی نتیجہ اخذ نہ کر سکا ۔

اور پھر صبح ہی صبح اس کی آنکھ کھل گئی ۔ گھڑی دیکھی ابھی پانچ ہی بجے تھے ۔ وہ بستر سے اٹھ کر باتھ روم چل دیا ۔ وہ چاہتا تو کچھ دیر اور بھی بستر میں پڑا رہتا مگر اُسے تو گھر پہنچنے کی جلدی تھی ۔

کیوں ؟ اس کیوں کا جواب تو اُسے خود بھی معلوم نہیں تھا لیکن شاید تھا بھی ایسا ہے ۔

بہرحال وہ جلدی جلدی تیار ہوا ۔ ناشتہ منگوا کر کھانے لگا تو مشکل سے چھ بج رہے تھے ۔ ڈرائیور اور چوکیدار جلدی جلدی اس کا سامان باندھ رہے تھے ۔

پھر اُسی لمحے فون کی گھنٹی بج اٹھی ۔ جنید کوارٹر سے اس کے لئے پیغام تھا کہ وہاں سے سائٹ پر سے دو تین ٹھیکے کا بھی معائنہ کرتا آئے ۔

جنید سے اُسے گہری مایوسی کا احساس ہوا ۔ کیوں ؟ یہ بھی وہ سمجھنے سے قاصر رہا ۔ بھاری سے قدم اٹھاتا وہ کھڑکی تک آیا ۔ تھوڑی دیر بلا مقصد وہاں کھڑا رہا ۔ مگر پھر

اچانک ہی مسکرا دیا ۔ گھر پہنچنے کا کیا خبط اس کے سر پر سوار ہوا تھا ؟ ۔ مس فصیح احمد سے اپنے رویے کی معافی مانگنے کو کتنا اہم سمجھ لیا تھا ۔ اگر

نہیں - یہ دونوں باتیں خوش کن ضرور تھیں - مگر ایسی بھی نہیں - گھبراہٹ نسیم
کو تو وہ ہر دورے کے اختتام پر ملنے جاتا تھا - تب تو ایسی کیفیت کبھی نہ ہوئی
تھی - پھر؟

پھر - کیا؟ ... "نہیں" ـــ

آگے وہ سوچنا ہی نہیں چاہتا تھا - بس منیب احمد سے جھگڑا پر پریشانی
کیا ہوئی تھی - کہ اب وہ مسلسل وہی کچھ سوچے جا رہا تھا -

تمام راستہ وہ عجیب سی ادھیڑ بن میں مصروف رہا - گولائیوں پہ گھومتی
چکنی سڑک پہ چلتی جیپ بڑے سے آہنی گیٹ کو کراس کرنے لگی - تو وہ چونکا -
پھر

اپنی کوٹھی کے گیٹ پہ پہنچا تو دل کچھ بے ترتیب سا ہو کر دھڑک اٹھا -
جیپ بجری کی سڑک پہ چلتی سیب والی پہاڑی کے دامن سے ہوتے
طویل و مرغولی موڑوں سے گزرتی ہوئی برآمدے کے سامنے جا کر رک گئی ـــ

چھ بج چکے تھے - شام کے سائے سایوں میں باہر کی ہر چیز دھندلی دھندلی
سی نظر آ رہی تھی - سفر کے کپڑے تبدیل کر کے وہ ابھی ابھی اپنے بیڈروم میں آ کر
نرم نرم کے صوفے پہ بیٹھا تھا - نسیم اس کے بالمقابل صوفے پہ بیٹھا چلغوزے
چھیل چھیل کر کھاتے ہوئے اسے پانچ دن کی خبریں سنا رہا تھا -

ادھر کی - ادھر کی - اور ...

گرم گرم کافی کی چسکیاں لیتا وہ بیٹھے سے مسکراتا رہا - اس کی بے تکی باتیں کرتا رہا
اور نسیم نے حسب عادت اپنی ٹریننگ کا حال سنا دیا ... اچانک ہی نسیم

سمجھ لیگا ۔ اگرچہ اُسے
یقین تھا کہ کوئی اس قسم کی بات نہیں ہے ۔ مگر پھر بھی وہ خائف سا ہو رہا
تھا ۔ دل میں کوئی چور سا تھا جیسے ۔ " تم نے پوچھا نہیں کہ وہ کہاں گئی ہے ؟" نعیم کچھ
چونکا ۔ وہ
غالباً مسٹر جمیل آج اس کے متعلق بات کرنے سے کترا رہا تھا ۔ " پوچھ لوں گا
ذکیہ نے بتایا ہوگا ۔" اس کی آواز میں حسبِ عادت جھنکار نہیں تھی ۔
" میں تمہیں بتا دوں گا جب لوٹ آئے گی ۔"
" مجھے کیا ضرورت ہے جاننے کی ۔" اس کے چہرے پر مایوسی کے سائے نمایاں ہو
گئے ۔
" کیا بات ہے ؟ آج کچھ ناراض لگ رہے ہو مجھ سے ؟" نعیم حیران رہ گیا ۔
" میں کیوں ناراض ہوں گا تم سے بس ... " وہ کچھ سنبھلے ۔ " بس ایسے ہی یونہی ۔"
" کوئی بات ہے ضرور ۔" نعیم اس کی اندرونی کشمکش سے بے خبر نہیں تھا ۔
اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اندر ہی اندر کس ادھیڑبن میں مصروف
ہے ۔ ایسے اُلجھے تاروں کی جس کا خود کامران کو سرا ڈھونڈے نہیں مل رہا تھا ۔

رات پھر اسی ادھیڑبن کی نذر ہو گئی ۔ وہ کسی کام کے سلسلے میں چند دن کے
لیے کراچی گئی تھی ۔ یہ اسے نعیم سے معلوم ہوا تھا ۔ وقت

کے ساتھ روا رکھا تھا اس کا خیال تھا۔ اُس کی یہ خلش انوکھی سی چبھن اور بے نام
سی اُلجھن ختم ہو جائے گی۔ اب تو اُس نے اُس سے معافی مانگنے کا خیال بھی ترک
کر دیا تھا۔ اس کا خیال ہی اُس کے اعصاب پر اس بری طرح سوار ہوا تھا کہ وہ لہریا
نظر آنے لگا تھا۔

وہ کسی طور پر شکست قبول کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اُس نے تو اسی کے
ساتھ مذاق کیا تھا چھیڑا تھا تنگ کیا تھا۔ اُس سے تو نہیں کہ اُس سے۔ یا اُس کی
نہ آنکھوں سے متاثر ہو کر ہتھیار ڈال دیے اس کے سامنے۔ دوسرے لفظوں میں
آنے ... تو کیا وہ اُسے اچھی لگنے لگی تھی؟
مذاق ہی مذاق میں۔ چھیڑ ہی چھیڑ میں۔
"نہیں" ۔ وہ بوکھلا اٹھا۔ نہیں۔ نہیں۔ یہ سب اُس کے پچھلے کرتوتوں کا ردعمل
تھا کہ ... مسلسل اُسی کے متعلق سوچے جا رہا تھا۔ ایک
جھٹکے سے اُس نے کمبل ہٹائے اور بستر سے نکل آیا۔ گھڑی دیکھی ساڑھے
پانچ بجے تھے۔ وہ باتھ روم میں چلا گیا۔ گرم پانی سے نہایا۔ تو طبیعت بحال
ہوئی۔ ڈریس اپ ہو کر وہ کمرے میں آیا۔ چند منٹ بے مقصد کھڑکی کے سامنے
کھڑا رہا۔ نعیم تو ہوسٹل گیا ہوا تھا۔ ان دنوں وہ ہر شام دو گھنٹے کے لیے
combine study کے لیے ہوسٹل چلا جاتا تھا۔

وہ آہستہ قدم چلتا کوریڈور میں نکلا۔ وہاں سے ہوتا وہ کچن کی طرف گیا۔
بیرے کو ... چائے کو کہا۔ اور خود پیچھے کی طرف ہاتھ باندھے بھاری سے قدم اٹھاتا
آہستہ آہستہ پھر اپنے بیڈروم کے سامنے برآمدے کے کونے میں آ گیا۔

طرف کرلیا۔

اور پھر

اُسے اپنی بیقراریوں کا واضح حل مل گیا۔ وہ اُسے ہی دیکھنے کو بیقرار تھا۔
تو اتنی ڈھیر ساری پشیمانی اُسے اسی لئے تھی۔ کہ وہ۔
وہ۔ نادانستگی میں اُسے پسند کرنے لگا تھا۔
اس انوکھے جذبے سے آشنا ہوتے ہوتے وہ ڈھیر سے سکھ اُٹھا دیا۔
دل و دماغ کی چھڑی کئی دنوں کی جنگ اچانک ہی ختم ہوگئی۔ ذہنی کشمکش
کو جیسے قرار آگیا۔

پھر مس فینیچ کی نظر اُس پر پڑی۔ ایک پل کو اُس کی آنکھوں میں جانی
پہچانی سی چمک لہرائی۔ مگر نظریں چار ہوتے ہی پلکیں گر گئیں۔ چہرے کا رنگ
بدل سا گیا۔ چند لمحے یوں ہی کھڑی رہی۔ پھر اچانک ہی مڑ کر اپنے کمرے میں
چلی گئی۔

وہ خوبصورتی سے ہنس دیا۔ اُس کی لوفرانہ حرکتوں کے سامنے اُس
نے بھی ہتھیار ڈال دیے تھے۔ مسافرانہ کرائی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی اندر گھس گئی تھی۔
ملنے سے فارغ ہو کر وہ دیر تک باراموں کے دامن میں آلو کی کھیتی کی گوڈنڈی
پر آہستہ آہستہ ٹہلتا رہا۔ مگر پلیس کے پاس نہیں گیا۔ جانے کیا ہو گیا تھا اُسے؟ تو اس
طرف جاتے ہوئے بھی اتنا قریب نہ جا سکا۔ شاید عرصے بعد وہ اپنے حواسوں میں
آیا تھا۔ اور اُسے اچانک پھر سے احساس ہوا تھا، کہ ان لوگوں کے اتنے قریب
بلا اجازت یا بلا مقصد چلے جانا بعید از اخلاق ہے۔

وہ دوبارہ باہر نہیں آئی۔ اس کی موجودگی سے خائف تھی یقیناً۔
دروازہ کھلنے کی آہٹ پر اس نے مڑ کر دیکھا۔ برآمدے میں نعیم چلا آ رہا تھا۔ وہ دور ہی سے لمبے لمبے قدم اٹھاتا اس کی طرف بڑھا۔ جیسے کھیتوں میں چہل قدمی کرنے پر بھی وہ نعیم کی نظروں میں مشکوک ہو جائے گا۔

پھر روز ہی ایسا ہوتا رہا۔ نعیم چار بجے بھی ہوسٹل سے دوڑا چلا آتا۔ وہ اکیلے ہی شام کی چائے پیتا۔ پھر باہر نکلتا۔ مگر زیادہ تر سامنے کی طرف۔ یا پھر اوپر ہی اَدھ کچی کی طرف والی پہاڑی کے آخری ٹیرس پر مڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر اطراف کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتا۔ مگر دل بھی چاہتا تھا کہ پچھلی طرف جائے۔ اسے بھی دیکھے۔ مگر

روزانہ اس طرف بیٹھنا یا گھومنا اسے اچھا نہ لگا۔ کل بھی وہ پچھلی طرف مس روم کی طرف ٹہلتا ہوا گیا تھا۔ وہیں وہ اسے ٹیرس پر بیٹھی نظر آئی تھی۔ پھر اسے دیکھتے ہی میز پر سے اپنی کتابیں سمیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

کپڑے بدلتے بدلتے وہ مسکراتے ہوئے اس کے متعلق سوچتا گیا۔ تیار ہو کر وہ باتھ روم کے راستے نمبر بیس سٹنر نین والے اندرونی برآمدے کے آخری سرے پر نکل آیا۔ یونہی چلتا وہ سیب کے باغ والی پہاڑی کی طرف سیڑھیاں اترنے لگا۔ پھر اچانک اس کی نظر بائیں طرف ٹیرس پر پڑی۔ مس فصیح احمد اپنے کمرے کے دروازے میں سے سر باہر ڈال کر دزدیدہ نظروں سے ارد گرد دیکھ رہی تھی۔ شاید یہ دیکھے کہ وہ موجود نہ ہو تو وہ باہر آ کر بیٹھے۔ اچھی طرح تسلی کرنے کے بعد اس نے پورا دروازہ کھولا۔ اور باہر آنے کے لئے قدم بڑھائے۔ مگر

جوں ہی اُسے آخری سیڑھی اتر کے سیب کی پہاڑی کی جانب بڑھتے دیکھا۔

وہ اُلٹے قدموں اندر جا گھسا۔

وہ بڑی دیر کی روکی اپنی ہنسی مزید نہ روک سکا۔ کھل کر ہنس دیا۔

آگے ہی آگے بڑھتا وہ سیب کے درختوں کے بیچوں بیچ چلتا سامنے کی طرف گیا۔ اور پھر مہمان خانے کی سیڑھیاں اترتا نیچے آنے لگا۔

"پھر چہل قدمی ہو رہی ہے؟" نعیم نے سکوٹر گیٹ پہ ہی روک کر اُس کی طرف بڑھتے ہوئے معنی خیز انداز میں پوچھا۔ "میں تو اس طرف پھر رہا ہوں۔" وہ اپنی بوکھلاہٹ پر قابو نہ پا سکا۔

"تو آؤ ادھر اسی طرف پھریں۔" اُسے ہاتھ سے پکڑا تو وہ اسی طرف جانے لگا۔

"نہیں یار۔ اچھا نہیں لگتا۔" وہ واپس ہاتھ کھینچ کر پھر اترنے لگا۔

اور نعیم ششدر سا اُسے دیکھتا رہ گیا۔ کچھ دنوں سے وہ کامران کی بدلی ہوئی حالت محسوس کر رہا تھا۔ اس نے آج کل لڑکی سے چھیڑ چھاڑ اور پھر اس چھیڑ چھاڑ کی تفصیل اُسے بتفصیل بتانا بند کر دیا تھا۔

بالآخر اُس لڑکی پر اُسے ترس آ گیا تھا۔ اچھی خبر ....

لیکن — وہ تو کہتا تھا ایسا ممکن ہی نہیں۔

اُس کے پیچھے پیچھے جاتا وہ بھی اُس کے بیڈروم میں داخل ہو گیا۔

"آج میرے پیچھے کیا کیا ہوا؟ میرا مطلب ہے میں تمہیں دو ڈھائی گھنٹے بعد دیتا ہوں۔" صوفے پہ اس کے بالکل قریب بیٹھتے ہوئے نعیم پھر گویا ہوا۔

"کچھ نہیں ہوا۔"

"یار! تم بجھے بجھے سے نظر آتے ہو۔ نروس تو نہیں ہو رہے؟"

"کام زیادہ ہوتا ہے آجکل۔ نمل غبار چھٹنے کا وقت نہیں ملتا۔"

"تو تم شام کو ہمیشہ سے پہلے جانے کے بعد آفس کا کام کرتے رہتے ہو؟" ایک مبہم سے خیال کو تقویت مل رہی تھی۔

"نہیں۔ نہیں تو" وہ پاس پڑا رسالہ اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگا۔

"پھر؟ پہلے نہیں اس سے؟" نعیم کی پوری شخصیت پر کلا نظر آ رہا تھا۔

"بھئی کس سے؟" رسالہ رکھ کر وہ مصنوعی جھنجھلاہٹ سے بولا۔ وہ جو اس موضوع کو کسی طرح چھوڑتا نہیں تھا۔

"اپنی پڑوسن سے۔"

"۔۔۔ کون ہے؟" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

اور نعیم نے اس کے زور سے کہنی ماری۔

"مس نسیم احمد۔"

"اوہ۔ اچھا۔۔۔" اس نے ہنستے ہوئے گویا لاپروائی سے کہا

"مجھے دال میں کچھ [illegible] ہے۔"

"وہ کالا نکال کر پھینک دو۔ دال صاف ہو جائے گی۔"

"لیکن تم صاف نہیں لگ رہے۔"

"بھئی بشیر! اب ختم کرو یہ Topic۔ کوئی اور بات کرو۔ کچھ اپنی پروگریس بتاؤ۔ پاس ہونا ہے اس سال یا ابھی نہیں؟"

"میری بات چھوڑو۔ اپنی بتاؤ۔ بی۔اے کلیئر کرنا ہے اس سال یا نہیں؟"

اور کامران زور سے قہقہہ لگا اٹھا ۔

"وہ دیکھیں بیضیح احمد باہر نکلی ہیں ۔" ڈریسنگ روم کے کھلے دروازے سے ڈریسنگ روم کی کھڑکی میں سے اس کی ایک جھلک واقعی نعیم نے دیکھ لی تھی ۔

"تو میں کیا کروں ۔" وہ بدستور اپنی سامنے پھیلائی ٹانگوں کو تکتے ہوئے بولا ۔

"کامران !" نعیم نے اپنی پانچوں انگلیاں اس کے آگے نچائیں "کیا ہو گیا ہے تمہیں ؟" ۔ وہ واقعی کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا ۔

یا تو کامران نے مذاق چھوڑ چھاڑ دیا تھا ۔ اور اب اس کے متعلق مزید کچھ سننے کو تیار نہیں تھا ۔ یا

پھر شاید اسے پسند کرنے لگا تھا ۔ اسے کچھ شک ضرور پڑ گیا ۔ مگر منہ سے بولا نہیں ۔ "کچھ نہیں ۔" کامران مسکراتے ہوئے بولا ۔ اور جھک کر اپنے بوٹ کے تسمے کھولنے لگا ۔

نعیم زیر لب مسکرایا ۔ دال میں ضرور کالا تھا ۔

لیکن اس نے موضوع بدل دیا ۔ وہ

منتظر تھا کہ کب کامران خود اسے بتاتا ہے سب ۔

موسم بھیگا بھیگا تھا ۔ سیاہ بادل پورے آکاش کو گھیرے ہیں لئے ہوئے تھے ۔ سردی اچانک ہی بڑھ گئی تھی ۔ وہ کھڑکی کے پاس آرام کرسی پر نیم دراز تھی ۔

ہاتھ میں کافی تھامے وہ بائیرن کی حالاتِ زندگی پر لکھے نوٹس پر سرسری نظریں ڈالتی مصروفیت کی منتظر تھی۔

باہر بوندا باندی ہو رہی تھی۔ اس لئے آج اس نے آسیہ کو ملنے کے لئے ڈرائیور بھیج دیا تھا۔ کل سے وہ اُس کے پاس آکر اکٹھا پڑھ لیا کرتی تھی۔ اس وقت بھی وہ تھوڑی دیر میں پہنچنے والی تھی۔

تیز بارش کی موٹی موٹی بوندیں ٹین کی چھت پر پڑ پڑ کر شور مچانے لگیں۔ تو وہ چونکی۔ کافی سامنے کی میز پر رکھی۔ اور اٹھ کر چوڑی کھڑکی کے پردے کھسکاتے ہوئے بند شیشوں کے اُس پار دیکھنے لگی۔ زوروں کی بارش سے پانی کی چادر سی تن گئی تھی۔

اس نے سامنے دیکھا۔ برآمدے کے مرمریں ستونوں سے ٹیک لگائے وہ دور ندی کی طرف نظریں جمائے کھڑا تھا۔

اُس دن کے بعد سے جانے کیا بات تھی؟ وہ اپنے برآمدے میں دور بادام کے باغ کی طرف۔ اپنے سن روم کے پاس یا کبھی کبھار جب وہ باغ کی طرف جاتا اُسے دکھائی دیتا۔ اُس نے ٹیرس کے رخ پر کبھی قدم نہیں بڑھایا تھا۔ بلکہ وہ تو اب اس طرف ایک آدھ غیر ارادی نگاہ کے علاوہ دیکھتا ہی نہیں تھا۔ کیا ہو گیا تھا اُسے؟

اچانک ہی اپنی پراپرٹی پر اُس نے حرکت چھوڑ دی تھی۔ بڑا مسرور سا نظر آتا تھا۔ آج کل۔ جیسے پچھلی آئیل کو ڈوسے کوئی تعلق ہی نہ رہا ہو اس کا۔

چند ایک بار اُسے ٹیرس پر بیٹھے دیکھا بھی تھا۔ مگر دھیرے سے مسکرا یا بھی

راہ ہو لیا تھا ۔ نہ پاس آیا تھا ۔ نہ کوئی فضول حرکت کی تھی ، نہ گھورا تھا ۔ نہ ٹاکا تھا ۔
یہ اچانک

اتنی زبردست تبدیلی ؟ ۔

اس نے دیکھا اس وقت بھی ؛ برستی بارش کے اُس پار دور سڑک کی

پانیوں میں جانے کیا تلاش کر رہا تھا ؟

سیاہ رنگ کا گرم سوٹ پہنے سوچوں میں ڈوبا وہ خاصا پُروقار نظر آ رہا

تھا ۔ personality میں تو تھا ہی نکھار ۔ " تو یہ بات ہے ؟ " ۔ جانے کب سے

صوفیہ پاس کھڑی اس کی نظروں کا تعاقب کر رہی تھی ۔

اور وہ ہڑبڑا کر کھڑکی سے پرے ہٹ آئی ۔

" کس وقت آئیں ؟ "

" تمہیں کیوں بتاؤں " ۔ وہ بھی وہیں کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی ۔

" نہ بتاؤ " ۔ شانی پھر آرام چیئر پہ بیٹھ گئی ۔

" اچھا بتاؤ کیا ہو رہا تھا ؟ "

" تمہارے خیال میں اتنے فلیٹ سے اور پھر اتنی بارش میں کیا ہو سکتا تھا ؟ " ۔

" ہم ۔ نہیں " چڑاتے ہوئے بولی ۔

" تم سے نہیں اس سے ضرور کچھ کیا ہو گا " ۔

" جانے کیا ہوا ہے اُسے ؟ اب تو بالکل خاموش رہنے لگا ہے " ۔ وہ سنجیدگی

سے بولی ۔

" اور تمہیں فکر لاحق ہو گئی ہے ۔ کہ خدانخواستہ اسے کچھ ہو گیا ہے " ۔

"نہیں ہو گئی ہوگی نا فکر لاحق۔" وہ خواہ مخواہ بلش ہو گئی۔

"ویسے بڑا وہ تب بھی نہیں لگتا تھا۔" صوفیہ پھر مسکرا کر کہنے لگی۔

"یہی تو بات ہے کہ... بڑا نہیں لگتا۔"

"سچ؟"

"میں نے ایک حقیقت کہی ہے۔" وہ پھر بلش ہو گئی۔

"اور حقیقت کہتے کہتے تم بلش بھی ہو رہی ہو۔"

"بس کرو صوفیہ، تمہیں بھی سوائے اس کے اور کوئی بات ہی نہیں سوجھتی۔"

"ویسے تمہاری تو جان چھوٹ گئی نا۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

"اب وہ تنگ کچھ نہیں کرتا؟"

"اوں ہوں۔"

"لیکن تم اب بھی باہر نہیں نکلتیں۔"

"مجھے اب بھی ڈر لگتا ہے اُس سے، پتہ نہیں کیوں؟" وہ خفیف سا مسکراتے ہوئے بولی۔

"شانی! کہیں اس ڈر میں تم اُسے..." وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

"نہیں اوہ، بالکل نہیں، تم ذہن پر بوجھ مت ڈالو۔ آئی ایم سوری۔" اُس نے اُسے زبردستی کتاب پکڑا کے اپنے سامنے بٹھا دیا۔

"تم نے باقی تو اُسے پہلے کا سب معاف کر دیا ہے، کیا اس کا..."

فیل ہونا قابلِ معافی نہیں سمجھو گی؟" جمو قیہ پڑھتے پڑھتے بیچ میں بول اٹھی

"نہیں۔ یہ ناممکن ہے۔"

"کیوں مگر؟"

"نہیں پتہ تو ہے۔"

اور وہ پھر پڑھنے میں مصروف ہو گئی۔

"جب سے اس نے تمہیں تنگ کرنا چھوڑ دیا ہے تم نمبروں سے متاثر نظر آ رہی ہو۔"

"ہوں متاثر پھر؟" وہ جھنجھلا کر بولی۔

"تو پھر اس کا فیل ہونا بھی معاف کر دو۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"اس کا مطلب ہے وہ فیل نہ ہوا ہوتا تو تم اس وقت یقیناً اسے پسند کرتیں۔"

"شاید۔" وہ شرارت سے بولی۔ "شاید نہیں یقیناً۔"

"غالباً۔" وہ مزید شوخی سے بولی۔

"شانی! تم زبان سے اقرار نہ کرو وہ اور بات ہے۔ لیکن تمہاری آنکھیں تمہارا چہرہ سب اس کے حق میں بول رہے ہیں۔" وہ کتاب چہرے کے آگے کیے شانی کی سامنے والی کرسی پر بیٹھی پھر بول پڑی۔

اور شانی نے اسے کوئی جواب دیئے بنا ناول پھر سے کھول لیا۔

"ماما کو چاہیے اب جلدی گرم گرم شامی کباب اور ایک ایک کپ کافی بھجوا دیں"

"ایک پیالی چائے پر گزارہ ہے نہیں تو بھوک اور سردی میں ٹھٹھر رہا ہو گا۔"

"تجھے وہاں نہ بھجوا دوں اُٹھا کر؟" شانی جھنجھلا کر بولی۔

"میں تمہیں اُٹھا کر وہاں ڈال آؤں گی۔ یقیناً زیادہ خوش ہوگا۔"

"اب شاید اُسے زیادہ خوشی نہیں ہوگی۔"

"کیوں؟ اب کیا ہوا؟"

"اب وہ اس طرف دیکھتا ہی نہیں۔" اس نے معصومیت سے کہا۔

"اوہ! تو تمہیں واقعی افسوس ہو رہا ہے کہ وہ اب اس طرف نہیں دیکھتا۔"

"نہیں معوذیہ! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" وہ سٹپٹاتے ہوئے بولی۔

"کوئی بات نہیں میں اُسے کہہ دوں گی کہ وہ اس طرف ضرور دیکھے۔"

"میں نے شکر کیا ہے کہ وہ اس طرف نہیں دیکھتا۔"

"کیوں؟"

"بس! مجھے ڈر لگتا ہے اس سے۔" وہ بے بسی سی بولی۔

اور معوذیہ زور زور سے ہنسنے لگی۔ پھر اُٹھ کر دوبارہ کھڑکی میں کھڑی ہوگئی۔

"تو موصوف ہیں۔" وہ زیر لب بولی۔

اور شانی نے نظریں اُٹھا کر دیکھا۔

اس کا نوکر ایک کوٹ ہاتھوں میں لیے اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ اور وہ بے نیازی سے ہاتھ کوٹ کی آستین میں ڈالتا ہوا سامنے دیکھ رہا تھا۔

"اب تو نوکر بھی نظر آنے لگے ہیں۔" شانی دھیرے سے بولی۔

"دیکھ لیا تم نے۔ کیا شانِ بے نیازی ہے۔" معوذیہ ابھی بھی اُسے دیکھے جا رہی تھی۔ "نوکر کیا پہلے نہیں ہوتے تھے؟"

"یقین کرو صوفیہ! ایک بھی نوکر نظر نہیں آتا تھا۔ جن دنوں پاپا ولیم مجھے رکھتا تھا۔ ہر طرف خاموشی سی رہتی تھی۔ اب ہر طرف نوکر چاکر چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے نوکروں کو مخل ہونے سے منع کیا ہوگا۔" صوفیہ اب بھی سامنے دیکھ رہی تھی۔ "ظاہر ہے پھر میں یہ بات کس طرح کرتا ان کے سامنے۔" اس نے مزید کہا۔

ثانی پھر کتاب پر جھک گئی تھی۔ صوفیہ اسے سنجیدہ دیکھ کر کھڑکی سے ہٹ آئی۔ اور اسے دیکھا دیکھی وہ بھی سنجیدگی سے پڑھنے لگی۔

شام کے پانچ بج چکے تھے۔ نعیم حسب معمول ہوسٹل جا چکا تھا۔ کامران تیار ہو کر باہر آیا۔ ایک کپ چائے برآمدے میں پی۔ اور ہال سے اٹھتا ہوا بادام کے باغ والی پہاڑی کے ساتھ ساتھ چلتا سن روم کے پاس سے گھومتا سامنے آیا۔ اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترتا ندی میں اتر گیا۔

تھوڑی دیر اطراف کو تکتا رہا وہ ندی کے کنارے کنارے آگے بڑھنے لگا۔ موسم بے حد حسین ہو رہا تھا۔ بادل آج بھی پورے آسمان کو گھیرے میں لیے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اور ندی کا پانی مخصوص شور کے ساتھ بہتا چلا جا رہا تھا۔ وہ کنارے کنارے چلتا کوٹھی سے کافی دور نکل آیا۔

یہاں دائیں طرف وہی سرمئی پہاڑ اور ندی۔ اور بائیں طرف چھوٹے چھوٹے کھیتوں میں پکی ہری فصل آگے نظر آ رہی تھی۔

کمر پہ پیچھے کی طرف ہاتھ باندھے وہ آہستہ آہستہ چلتا ہی گیا۔ پھر اُسے وقت کا احساس ہی نہ رہا۔ شام ڈھلنے لگی تو

اُس نے واپسی کے لیے قدم بڑھائے۔ آسمان پر چند پرندے تیزی سے اپنے آشیانوں کی طرف رواں دواں تھے۔ ہوا مزید یخ بستہ ہو گئی تھی۔ بادل اور بھی بڑھ گئے تھے۔ اور ندی کا پانی مزید چمکنے لگا تھا۔

وہ پھر اُسی کنارے پر چلتا ہوا واپس آنے لگا۔ تھوڑے فاصلے پر ہی تھا کہ سامنے ندی میں سنگِ مرمر کے چبوترے پر نظر پڑی۔ اُس کی طرف رخ کیے بیٹھی تھی اور ارد گرد سے بے نیاز کھڑی تھی۔ ایک لمحے کو وہ جھجک گیا۔ چبوترہ پہاڑی اور درختوں سے گھرا بہت تنگ سی جگہ میں واقع تھا۔ وہ تنہا بھی تھی۔ اُسے آگے جانا مناسب نہ لگا۔ مگر

پھر جانے کون سا جذبہ تھا جو اُسے آگے بڑھنے پر مجبور کرنے لگا۔

اُس نے دنوں بعد اُسے دیکھا تھا۔ تنہائیوں میں شدت سے چاہا تھا کہ اُسے دیکھے۔ ملے۔ باتیں کرے۔ مگر اول تو اُس کی طرف بلا مقصد چلے جانا اُسے مناسب نہیں لگتا تھا۔ اور پھر وہ کہیں نظر آ بھی جاتی تھی تو اُسے دیکھتے ہی اندر گھس جاتی تھی۔

وہ چاہتا تھا کہ اُسے دیکھے نزدیک سے۔ باتیں کرے اُس سے ڈھیر ساری فطری تقاضا تھا یہ۔ مگر موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ ایسا کرنے کا۔

دلنشیں مسکراہٹ ہونٹوں پہ لیے وہ خراماں خراماں آگے بڑھنے لگا۔

اور تبھی شانی چونک کر اُسے دیکھنے لگی۔ شام کے گہرے ہوتے سایوں میں
بھی وہ اُسے بخوبی پہچان سکتی تھی۔
لمبا قد۔ چوڑے شانے۔ بکھرے بال۔ دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتا وہ قریب
آتا گیا۔ اور

شانی جانے کیوں؟ سفید پڑتی گئی۔ شام اندھیری ہو رہی تھی۔ اور وہ
بالکل تنہا تھی۔ بہت دنوں بعد۔ بہت بڑا مذاق بھی تو ہو سکتا تھا۔ اُسے دیکھتے
دیکھتے وہ پیچھے ہٹنے لگی۔ پھر کامران نے دیکھا۔ وہ ایک بھی قدم اور پیچھے ہٹتی تو
پانی میں جا گرتی۔ اُس نے ہاتھ تھام پیچھے ہٹایا۔ اور اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی
کامران لپک کر آگے بڑھا۔ اُس کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے اُسے اپنی طرف
کھینچا۔ اور ساتھ ہی اُس کی بلند ہونے والی چیخ اُس کے منہ پہ ہاتھ رکھ کر دبا دی۔
سب اتنا غیر متوقع ہوا۔ کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اُسے معلوم ہوتا کہ اسکی
آمد پر وہ اس قدر گھبرا جائیگی۔ تو وہ کبھی وہاں نہ آتا۔
کسی نے اُس کی چیخ سُن لی ہوتی تو؟
نوکر چاکر آ جاتے اور آ کے شام کے اندھیرے میں اس تنگ سی جگہ میں اُس
کے ساتھ دیکھ لیتے تو؟ دونوں کی کیا پوزیشن ہوتی؟ ایک ذمہ دار اور اہم
پوسٹ پر فائز تھا وہ۔ چھوٹا سا خلا تھا۔ بات کہاں سے کہاں تک پہنچ سکتی تھی
"پلیز شانی۔ گھبرائی کیوں ہو؟ آؤ میں تمہیں اوپر چھوڑ آؤں"۔ اُسی طرح اسکی
کمر میں ہاتھ ڈالے سہارا دیتے ہوئے وہ اسکی سیڑھیوں کی طرف بڑھتے ہوئے نرمی
سے بولا۔ "آپ۔۔۔ آپ؟" وہ اب بھی سہمی جا رہی تھی۔ "تم اتنا گھبرا ئی کیوں ہو

مجھے دیکھ کر . . . " وہ آہستہ آہستہ اُس کے ساتھ ساتھ چلتا اپنائیت سے بھیگتا گیا۔
تنہائی زدہ وجود بھی اُس کے سہارے آدھی جڑتی گئی۔

"میں نے تمہارے ساتھ مذاق کیا تھا۔ چھیڑا تھا تمہیں۔ تم نے اُسے اتنا سیریس لے لیا ہے"۔ وہ دھیرے سے مسکرایا۔ "معاف کر دو اب۔ آئندہ اس طرح نہیں ہوگا۔ ٹھیک ہے نا؟" وہ اُسکی حیرت سے کھلی آنکھوں میں تکتے ہوئے بولا۔

وہ خاموش رہی۔ اُسے تو کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی۔ کتنا تضاد تھا۔ پہلے کے اس آدمی میں اور —

اب کے اس آدمی میں۔

"معاف کر دیا؟" آج وہ پہلی بار اُن کے ٹیرس پر آیا تھا۔

ٹیوب لائیٹ کی دھندھیاری روشنی میں اُس نے دیکھا۔

نازک سی کانچ ایسے بدن والی لڑکی کی نظریں جھکی جا رہی تھیں۔

کچھ اُس کی قربت کا اثر تھا شاید۔ کچھ اُسکی آنکھوں میں تبدیلی اَن کہی باتوں کا۔ اُس کی پلکیں جھکتی ہی چلی گئیں۔

وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

"معاف نہیں کرو گی؟" اُس کے چہرے پر بکھر آئی بالوں کی لٹ آہستہ سے پیچھے ہٹاتے ہوئے اُس نے پھر کہا۔

"آپ . . . آپ . . . . " اُس نے ایک پل کو جھکی پلکیں اٹھائیں۔

جانے کیا کہنا چاہتی تھی وہ؟ اُس کی بولتی نظروں سے نظر ملتے ہی اُس کی پلکیں پھر گرنے اٹھنے لگیں۔

"بہت تنگ کیا تھا میں نے ؟" ریلنگ پر رکھے اُس کے بیحد نازک سے ہاتھ پر اپنا بھاری ہاتھ رکھتے ہوئے اُس نے آہستہ سے پوچھا۔

کوئی جواب دیئے بنا اُس نے دھیرے سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ نیچے سے کھینچ لیا۔

وہ پھر مسکرا دیا۔

"معافی کے قابل نہیں ہوں ؟" اُس نے مزید پوچھا۔

اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کی بات پر مسکرا دی۔

"دیکھو میں ہاتھ جوڑ رہا ہوں" اُس نے جھکی پلکیں اُٹھا کر دیکھا۔ DASHING PERSONALITY والا دونوں ہاتھ جوڑ کر معصومیت سے کہہ رہا تھا۔

وہ پلکیں جھپکاتی رہ گئی۔

"چلو پہلے سوچ لو پھر معاف کرنا" وہ اُس کی پلکیں جھپکاتی آنکھوں کو تکتے ہوئے خوبصورتی سے بلش کر بولا۔

جبکہ اُسے یقین تھا۔ وہ مزید ناراض نہیں رہی تھی "سردی بڑھ رہی ہے تم اندر جاؤ۔ میں چلتا ہوں اب" ایک قدم آگے بڑھ کر وہ ریلنگ تک آیا۔

وہ اب بھی گم صم سی وہیں کھڑی رہی۔

"شب بخیر" اُس نے دھیرے سے کہا۔

اور آرام سے ریلنگ پھلانگ کر اپنی کوٹھی کے احاطے میں اُتر گیا۔

وہ دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتی اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔

"کل کے اس آدمی میں اور آج کے اس آدمی میں کتنا تضاد تھا؟
آنکھوں ہی آنکھوں میں وہ واضح طور پر بہت کچھ کہہ رہا تھا DASHING
DASHING تو تم پہلے بھی تھیں - لیکن RESPONALITY
بھیتیں۔"
"میں نے تمہارے ساتھ مذاق کیا تھا" خوبصورت مینٹل پیس سے لگی کھڑی
وہ دیر تک سوچتی رہی -

۱۷

خوبصورت انگریزی دھن منہ ہی منہ میں گنگناتا اس نے زور سے
اپنے بیڈ روم کا دروازہ کھولا -
"خیریت ہے؟" کونے میں رکھی اس کی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے نعیم بیٹھا
خط لکھتے لکھتے رخ موڑے بغیر گویا ہوا -
اور وہ ٹھٹک کر رہ گیا - دھن یکلخت ختم ہو گئی - جیسے بہت سی دھن کش
کو بھی نعیم نے اس کی چوری پکڑ لی ہو -
وہ آہستہ قدم چلتا نعیم کے قریب آ گیا -
"میں نے خیریت پوچھی ہے حضور کی؟" اس نے لوہا اپنے لکھے ہوئے
خط پر کتاب رکھ دی -
"ٹھیک ہوں" وہ اپنے کوٹ کے کالر سے کھیلتے ہوئے دھیرے سے بولا -

"آواز سے تو بخار معلوم ہو رہا ہے"۔ وہ اب بھی خط پر جھکا بیٹھا تھا۔
کامران وہاں سے چل کر کھڑکی تک آیا۔ بلا مقصد پہلے سے برابر کیے گئے
پردے دوبارہ برابر کرنے لگا۔

چند لمحے وہیں کھڑا رہا، پھر رخ پھیر کر نعیم کو دیکھنے لگا۔ وہ اب بھی تیزی
سے خط لکھنے میں مصروف تھا۔ کامران کچھ بے چین سا نظر آنے لگا۔

وہ چاہتا تھا نعیم کو سب بتا دے۔ چند دنوں سے جو وہ ایک میٹھی میٹھی سی
کسک اپنے پہلو میں محسوس کر رہا تھا۔ اس کے پس پشت جو جذبہ کارفرما تھا۔ اس
کی تفصیل اسے بتا دے۔ اسے کہہ دے کہ جو بجلی گری اس نے کی تھی۔ وہ حرف بہ
حرف صحیح نکلی ہے۔ اس نے آج تک کوئی بات اس سے نہیں چھپائی تھی پھر

اتنی بڑی بات۔ اتنا اہم انکشاف!

وہ کم از کم نعیم سے نہیں چھپا سکتا تھا۔ مگر

اسے الفاظ ہی نہیں مل رہے تھے۔ اور پھر جانے کیوں؟ اتنے بلند بانگ دعووں
کے بعد اس کی ہمت ہی نہیں پڑ رہی تھی۔ اس کے سامنے اقرار کرنے کی

دو قدم چل کر وہ پھر اس کے قریب چلا آیا۔

"کچھ UN EASY سے لگ رہے ہو" نعیم مزید تیزی سے خط لکھتے
ہوئے بولا۔

"ہوں۔۔۔ نہیں تو۔۔۔"

"بھئی TAKE IT EASY۔ ایسا ہوتا ہی ہے"۔ نہ وہ خط سے
سر اٹھا رہا تھا۔ نہ سنجیدہ ہو رہا تھا۔

وہ جھنجھلا سا اُٹھا۔

"مجھے وہ لڑکی اچھی لگنے لگی ہے" بڑا سا فائل اُٹھا کر اُس کے خط پہ رکھتے ہوئے وہ بلا تمہید بول اُٹھا۔

"کیا؟" پہلے سے شک سا ہونے کے باوجود وہ اُس وقت یوں اُچھل پڑا۔ جیسے اچانک ہی کسی نے پاؤں کے نیچے سے قالین کھینچ لیا ہو۔

"ہاں"۔ اُس نے خوبصورت پلکوں کو اثبات میں جنبش دی گا۔

اُس کے لبوں پہ مسکراہٹ تھی۔ رسی سی۔ خفیف سی۔ اِک دھماکہ خیز انکشاف کے بعد۔ نادم سی ہنسی۔

"ارے" نعیم سب چھوڑ چھاڑ کر سیدھا ہو کر اُس سے یوں مخاطب ہوا۔ جیسے دونوں نے کوئی ناقابلِ تسخیر قلعہ فتح کر لیا ہو۔ حالانکہ اُس نے خط نہیں لکھا۔

"یہ سب ہوا کیسے؟" نعیم اُس کے ہاتھ سے پکڑ کر قریبی صوفے پر اپنے قریب بٹھاتے ہوئے بولا۔

"بس ہو گیا"

"پھر بھی؟"

"بس ہو گیا نا"

"کیا ہو گیا؟" "اُس سے پیار ہو گیا"

"یعنی اچھی لگنے کے بعد اب پیار بھی ہو گیا؟"

"عشق ہو گیا ہے عشق"۔ وہ مزید شوخی سے بولا۔

"اچھا نا یار! یہ چکر چلا کیسے؟"

"بس چل گیا" ۔

"پھر بھی بتاؤ نا" ۔

"بس مجھے خود پتہ نہیں چلا ۔ کہ کیسے ہوا یہ سب ۔ ویسے وہ بے حد نازک ہے ۔ بہت خوبصورت ہے ۔ یہ تو سب میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا ۔ ان باتوں کا شاید مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا ۔

میں اسے چھیڑتا تھا ۔ وہ مشتعل ہو جاتی تھی ۔ چڑاتا تھا ۔ وہ چڑ جاتی تھی ۔ تب تو مجھے دلی سکون ملتا تھا ۔ پھر

چھیڑ چھاڑ حد سے بڑھ گئی ۔ وہ مجھے برا بھلا کہہ کر تھک گئی ۔ لاجواب سی ہو گئی ۔ پھر بجائے مجھے برا بھلا کہنے کے خاموش رہنے لگی ۔ اس پر بھی بس نہ ہوا ۔ مذاق ۔ چھیڑ چھاڑ بجائے کم ہونے کے بڑھتا ہی گیا ۔ تو وہ بے بس سی ہو گئی ۔

جب بھی میری کسی احمقانہ حرکت کا جواب نہ بن پڑتا ۔ تو رونے لگ گئی ۔" وہ آہستہ آہستہ کہتا گیا ۔ پھر دھیرے سے ہنس دیا ۔ "نہیں شاید مجھے ۔ ۔ ۔ ۔"

"نہیں بات بڑھ گئی" ۔

"ہاں" ۔ انس نے خوشدلی سے ہنستے ہوئے اقرار کیا ۔

"پھر وہ مجھ سے خائف رہنے لگی ۔ اپنے دروازے سے باہر نکلتے وقت ادھر ادھر دیکھ کر نکلتی ۔ یا پھر مجھے دیکھتے ہی گھبرا کر اندر چلی جاتی ۔

اور یوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"تمہارا جذبۂ شوق بڑھ گیا"۔

"ہاں۔ بلکہ جب میں اچھی طرح سوچتا ہوں تو وہ مجھے آخری چھیڑ چھاڑ بس یونہی اچھی لگنے لگی تھی۔ یہ اور بات تھی۔ کہ میں کچھ نہیں پا رہا تھا۔ یا یوں سمجھو کہ مجھے سے گزر رہا تھا۔ مگر اب سوچتا ہوں تو وہ مجھے وہیں سے اچھی لگنے لگی تھی"۔

"کیوں؟" نعیم اچانک بولا۔

"اچھی چیز اچھی لگتی ہی ہے"۔

"اور وہ تمہاری WILL POWER؟"

اور کامران نے جاندار قہقہہ لگا لیا۔

"سب ختم"۔ اس نے تھکے سے انداز میں کہتے ہوئے ٹانگیں نعیم کی گود میں پھیلاتے ہوئے سر صوفے کے بازو پر ٹکا دیا۔

"کچھ اسے بھی پتہ چلا ہے؟"۔

"کس بات کا؟"

"تمہارے عاشق ہونے کا"۔

"میں نے اس سے اپنی پچھلی حرکتوں کی معافی مانگ لی"۔

"کب؟"۔

"ابھی ابھی؟"۔

"بڑے موقعہ شناس ہو۔ مجھے ہوسٹل بھجوا کر خود گلچھرے اڑاتے ہو۔

اتنے دنوں بعد آج تو ملی ہے"۔

"کیا کیا باتیں ہوئیں؟"۔

"بتانے والی نہیں ہیں" وہ کروٹ کے بل لیٹتے ہوئے آنکھیں بازو سے ڈھانپ کر شرارت سے بولا۔

"تو یہ بات ہے؟"

"ہاں"

اور نعیم نے جھنجھلا کر اس کی ٹانگیں پرے ہٹا دیں۔ ساتھ ہی وہ لڑھکتا ہوا قالین پر جا گرا۔

"اب بھی نہیں بتاؤں گا" وہ وہیں پڑے پڑے ہنستے ہوئے بولا۔

"نہ بتاؤ" وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ "اچھا خاصا موڈ تھا خط لکھنے کا۔ آگئے ہے کر رونی صورت"

اور کامران پھر سے ہنسنے لگا۔

نعیم جھنجھلایا سا دوبارہ خط لکھنے بیٹھ گیا۔ کامران اٹھ کر کھڑکی کے قریب چلا آیا۔

"ابھی تک خوشبو آرہی ہے" ... پیا ہاتھ سونگھتے ہوئے جیسے نعیم کو چڑانے کو بولا۔

"کس چیز کی؟" وہ پھر اس کی باتوں میں آگیا۔

"اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تھا" وہ ڈھٹائی سے بولا۔

"تو نہ کہیں کے"

اور کامران کا فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا۔

"ہاتھ کیا سنگ کی شیشی تھی؟" وہ دوبارہ خط پر نظریں دوڑاتے

ہوئے بولا۔

"وہ سر تا پا خوشبو ہے۔"

"بس بس سن لیا۔ اب خط لکھنے دیجئے۔" وہ روزانہ ایک خط ثمینہ کو روانہ کرتا تھا۔ اسی رفتار سے وہاں سے بھی جواب آتا تھا۔

"کیا لکھتے رہتے ہو روزانہ؟"

"یہ بھی تجربہ ہو جائے گا جناب۔"

اور کامران نے مزید مداخلت مناسب نہ سمجھی۔

"اس کی نوبت نہیں آئے گی۔" وہ ڈریسنگ روم کی طرف چلتے چلتے بولا۔

"امی سے کہہ کر تو آگے سے بستر سے اڑا دوں گا۔"

"یعنی چٹ منگنی اور پٹ بیاہ۔" وہ سر جھکائے خط لکھنے میں مصروف تھا۔

"ہاں۔ میں تاخیر کا قائل نہیں۔" وہ مزید شوخی سے بولا۔

"WILLPOWER ہونی چاہیئے۔" نعیم نے کہا۔

اور کامران قہقہوں پر قہقہے لگاتا ڈریسنگ روم میں گھس گیا۔

۱۸

مقامی سینما میں MAYERLING لگی تھی۔ ایک عرصہ بعد ایک شاہکار فلم۔

صوفیہ کے ساتھ اس نے کالج میں ہی پروگرام بنا لیا۔

"یہ پکچر مس نہیں ہونی چاہیے۔ پھر جانے اتنی اچھی پکچر آئے۔ نہ آئے۔"
"اور ٹسٹ کی تیاری؟" صوفیہ نے کہا تھا۔
"تبھی فریش ہو کر ہی اچھی تیاری ہو سکے گی نا" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا۔

اور پھر کالج سے آتے ہی فون کر کے اس نے دو سیٹیں ریزرو کروا لیں۔ کھانا کھا کر، جانے کے لئے تیار ہونے لگی۔ نیوی بلو رنگ کا گرم سوٹ پہن کر اس نے نرم نرم قیمتی فر کا سفید کوٹ پہنا۔ بالوں کو کلپ لگاتے ہوئے سفید فر کی پیاری سی ٹوپی پہنی۔ نیوی بلو سوکس پہن کر اونچی ایڑی کی خوبصورت سفید جوتی پہنی۔ لباس پر اپنے مخصوص خوشبو کی سپرے کرتے ہوئے وہ ماما کے ہمراہ باہر نکلی۔ ڈرائیور نے اُسے دیکھتے ہی کار کا دروازہ کھول دیا۔ اور ماما کو خدا حافظ کہہ کر کچھ آگے چل کر اس نے صوفیہ کو بھی گھر سے لیا۔ اور ٹھیک وقت پر سینما پہنچی۔

گیلری میں گیٹ کیپر کی رہنمائی میں صوفیہ آگے آگے اور وہ پیچھے پیچھے چلتی سب سے اوپر کی قطار میں پہنچ گئیں۔ پھر اُس کی نشاندہی پر کونے کے ایک نرم آرام دہ صوفے پر یکے بعد دیگرے بیٹھ گئیں۔

اس نے گیلری میں ایک سرسری نظر ڈالی۔ رش زیادہ نہیں تھی۔ چیدہ چیدہ لوگ آ کے بیٹھے تھے۔ علاقہ چھوٹا سا تھا۔ چند ہی لوگ ایسے تھے جو ایسی پکچر کی قدر جانتے تھے۔ تمام علاقہ تو وہی انگلش پکچر پسند کرتا تھا جس میں شور شرابا ہو۔ ہاؤ ہو، ہر قسم کی ایکشن ہو۔

بہرحال نیچے تھرڈ کلاس اب بھی کھچا کھچ بھری تھی۔
اُس نے ایک نظر گھڑی پر ڈالی۔ دو چار منٹ اب بھی ...
ہونے میں۔

"اے شانی! تنویر وہ بھی آیا ہے۔"

"میرا کون؟" وہ کچھ نہ سمجھ سکی۔

"اپنے دائیں طرف دیکھو۔"

اور شانی نے اطمینان سے رخ دائیں طرف کر لیا۔

اس کے قریبی صوفے پر وہ بیٹھا تھا۔

"ہیلو۔" اُسے اپنی طرف دیکھتے پا کر وہ دھیرے سے بولا۔

"ہیلو۔" اُسے بھی کہنا پڑا۔

دیکھا، اُس کا رنگ پھر بدل گیا تھا۔ وہ کچھ بے چین سی نظر آنے لگی تھی پھر وہ رخ پھیر کر اپنی ساتھی سے کچھ کہنے لگی تھی۔ اس کی ساتھی نے جواب میں سامنے کی خالی سیٹوں (ریزروڈ) کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اور پھر وہ اُس کا ارادہ بھانپ گیا۔

"پلیز!" سیٹ کے بازو پر رکھے اُس کے ہاتھ پر اُس نے اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

وہ چونک کر اُسے دیکھنے لگی۔

"کیا بات ہے؟" اُس کے چہرے پر ناراضگی کے سائے اور لہجے میں تحکم سا تھا۔

جانے کیوں؟" وہ مرعوب سی نظر آنے لگی۔ اُس شام سے جب وہ اُسے ہیڈلس پڑا ملا تھا۔ وہ اُسے یکدم ہی بہت بڑا۔ سوبر سا۔ بُردبار سا لگنے لگا تھا۔

"کچھ نہیں" وہ معصومیت سے سر ہلاتے ہوئے بولی۔

اور اُس کی سہمی سی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ خوبصورتی سے مسکرا دیا۔ وہ بالکل یوں بولی تھی، جیسے تین سال کا معصوم بچہ کسی بڑے سے سہم کر جھوٹ بول دے۔

"جھوٹ نہیں بولا کرتے" وہ تنبیہی انداز میں بولا۔

وہ اب بھی اُس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ ہاتھ اب بھی اُس کے ہاتھ پر مضبوطی سے دھرا تھا۔

ثنائی کی پلکیں جھک گئیں۔ جانے کیا ہوا تھا؟ اُس شام بھی وہ اُس سے سامنے کچھ بول نہیں سکی تھی۔ وہ حال اب بھی تھا۔ وہ اچانک ہی اپنے آپ کو اُس کے سامنے بالکل چھوٹا سا محسوس کرنے لگی تھی۔ جیسے وہ بہت بڑا ہو اُس سے۔ ویسے اُس بات پر اُس کے لبوں پر مسکراہٹ ضرور پھیل گئی۔

"آئندہ نہیں جاؤ گی سمجھیں" اُس نے مزید کہا۔

وہ اب بھی خاموش رہی۔ ہاتھ البتہ اُس کے ہاتھ کے نیچے سے نکالنے کو کھینچا۔ مگر اُس کی گرفت خاصی مضبوط تھی۔ اُس نے گھبرا کر صوفیہ کی طرف دیکھا۔ وہ مسکراتے ہوئے سامنے دیکھ رہی تھی، تو وہ گھور رہی تھی سب؟ اُس نے ڈرتے ڈرتے کامران کے اُس طرف بیٹھے نعیم کو دیکھا۔ ٹانگ پر ٹانگ دھرے وہ بے نیازی سے سامنے دیکھ رہا تھا۔

وہ پریشان سی بیٹھی رہی۔ پھر ہال میں اندھیرا چھا گیا۔ وہ مزید گھبرا گئی۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ کم از کم اندھیرے میں وہ اس کے اس قدر قریب نہ بیٹھ سکے گی۔ اس نے ایک بار پھر اپنا ہاتھ کھینچا۔ پھر اس نے محسوس کیا وہ جھینپ رہا تھا۔

"میں یہاں نہیں بیٹھوں گی۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"کیوں؟" وہ بھی سرگوشی میں پوچھنے لگا۔

"میرا ہاتھ چھوڑ دیں۔" مگر

بجائے ہاتھ چھوڑنے کے اس نے نہایت اطمینان سے اپنی پانچوں انگلیاں اس کی نازک سی انگلیوں میں پھنسا لیں۔

"پلیز!" وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

اور کامران کو لگا۔ وہ ابھی رو دے گی۔

"میں ہاتھ چھوڑ دوں گا مگر یہاں سے اٹھنا نہیں ہے۔"

وہ خاموش رہی۔ اس نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ مگر اب کے اس کی گرفت اس کی کلائی پر تھی۔

"اُف۔" اور ساتھ ہی وہ دوسرے ہاتھ سے اس کا ہاتھ ہٹانے لگی۔

اس کی ہنسی وہ صاف سن رہی تھی۔

"میرا ہاتھ چھوڑ دیں۔" ساتھ ہی اس کی آواز رندھ گئی۔

"اوہ۔" اس نے ہڑبڑا کر اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ "آئی ایم سوری۔" وہ جلدی سے بولا۔

پھر مسٹر نعیم کے قریب ہوگیا۔ وہ بھی اپنی جگہ سے ہنس اٹھی پھر
دونوں کے درمیان اب کافی فاصلہ حائل تھا۔ وہ بظاہر کچھ دیکھ رہی تھی۔
مگر وہ مڑ نہیں رہا تھا جو ہال میں آنے سے قبل اُسے متوقع تھا۔ کامران
اور نعیم اللہ خوب باتیں ادا کر رہے تھے۔ وہ اچھی طرح محسوس کر رہی تھی۔

پھر یک بیک ہوئی ہال میں روشنی ہوگئی۔ کامران نے ایک اچٹتی نظر اس
پر ڈالی سفید روئی کے گالوں کی طرح نرم گوشت اور ہمرنگ ٹوپی میں وہ بہت پیاری
اور معصوم لگ رہی تھی۔ چھوٹی سی۔ گڑیا سی۔ جانے کیا تھا؟ وہ جب بھی اُسے
دیکھتا تو اُسے بہت چھوٹی سی لگتی۔ بالکل جیسے چند سال کی معصوم سی بچی ہو۔
حساس کتنی نازک سی۔ ذرا سی بات پر رو پڑتی تھی۔

اسکول کی ساتھی اُس کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ وہ بھی مسکرا رہی
تھی۔ پھر کافی دیر بعد اُس نے ڈرتے ڈرتے دائیں طرف دیکھا تھا۔ اور
وہ سامنے دیکھتے ہوئے خوبصورتی سے مسکرا دیا تھا۔ کتنی گھبرا گئی تھی۔

ان کی قربت سے۔ معصوم سی چھوٹی سی۔ یکا یک اسی نازک لڑکی۔

"تم بہت بُرے ہو اور وہ بالکل دھان پان سی ہے" اُسے ابھی ابھی
تھوڑی دیر قبل نعیم کی کہی ہوئی بات یاد آگئی۔

اور وہ زور سے ہنس پڑا تھا۔

"بات غور طلب ہے سمجھنے والی نہیں"۔

اور وہ مزید ہنس دیا تھا۔

"بالکل ہی دھان پان سی ہے۔ دبلی پتلی سی"۔ وہ پھر بولا تھا۔

"جغرافیائی لحاظ سے بھی بہت دلکش ہے"۔ اس نے شرارت سے کہا تھا۔

"بدمعاش" نعیم زور سے بولا تھا۔

اور وہ دیر تک ہنستا رہا تھا۔

بہرحال ٹھیک تھی، اس کے ذہن پر بھاری سا اثر تھا۔

رات سوتے وقت پھر اس کی صورت نظروں میں پھرنے لگی۔ اور پھر اس نے سرہانے رکھے فون پر اس کے نمبر ڈائل کر دیئے۔

"یس شانی نعیم احمد سپیکنگ" وہ ماؤتھ پیس میں بولی تھی۔

"جاگ رہی ہو؟" وہ دھیرے سے بولا۔

"جی۔۔۔ جی۔۔۔؟" وہ اس کی آواز پہچان گئی تھی جبھی ہکلانے لگی تھی۔

وہ ہولے سے ہنس دیا۔ آج بجائے مشتعل ہو کر چیخنے چلانے یا پھر ڈانٹنے کے وہ بوکھلا گئی تھی۔

"پھر گھبرا گئیں؟"

"جی نہیں تو۔۔"

"اچھا بتاؤ مجھے دیکھ کر گھبرا کیوں جاتی ہو؟"

تیز تیز سانسوں کے ساتھ اسے مدھم سی ہنسی کی آواز سنائی دی۔

"پھر ہنسی لگی؟"

"جی" وہ کچھ سنبھلتے ہوئے دھیرے سے بولی۔

اور پھر مسکرا دیا۔

پچھلے چند دنوں سے وہ بھی کچھ سہمی سہمی سی دبی دبی سی رہنے لگی تھی۔

"تم اپ سیٹ کیوں رہنے لگی تھیں؟"۔ وہ شاکی سے لہجے میں بولا۔

وہ خاموش رہی۔

"بولو نا"

"کیا کہوں؟"

"اپ سیٹ کیوں رہنے لگی تھیں؟"

"یوں ہی..."۔

"مجھے معاف نہیں کیا اب تک؟"

"اوہ"۔ وہ دھیرے سے ہنس دی۔

"بولو نا"۔

"مجھے نیند آ رہی ہے"۔ وہ جواب دینے سے کترا رہی تھی۔

"اچھا سو جاؤ"۔ دانش نے ایک دم ہی فون بند کر دیا۔

حیرت سے وہ خالی خالی نظروں سے ریسیور کو دیکھتی رہی۔

کیا وہ واقعی چاہتی تھی کہ وہ بولنا بند کر دے؟ کیا نیند کا اس نے اسی لیے بہانہ بنایا تھا؟ یا وہ اس کی بات کا جواب نہیں دے پا رہی تھی۔ اور اسی لیے نیند کا کہہ دیا تھا۔ یہی تجزیہ کرتے کرتے وہ اٹھی۔ کمرے کی لائٹ آف کی اور سرہانے کا لیمپ آن کرتے ہوئے بستر میں گھس کر انگریزی کی کتاب کھول لی۔

تبھی کوئی گھنٹے بھر بعد پھر گھنٹی بج اٹھی۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے ریسیور

اٹھایا۔ اور اسی طرح کتاب پر نظریں جمائے کان سے لگا دیا۔

"جی۔ کون بول رہا ہے؟" وہ بے دھیانی سے بولی۔

"تو محترمہ کو نیند آ رہی تھی؟"

"اوہ آپ ہیں؟"

"تو تم مجھے جانتی ہو؟"

وہ سٹپٹا کر رہ گئی۔

"اوہ۔ ہاں میرا نام تو تمہیں معلوم ہی ہے۔ اچھی طرح۔۔۔"

"جی؟"

"ایک بات پوچھوں؟"

"جی"

"تم نے مجھے ڈانٹا نہیں۔۔۔"

اس کی سانسیں پھر تیز ہونے لگی تھیں۔

"ہوں۔۔۔ بتاؤ نا بھئی بولو نا" وہ مصنوعی جھنجھلاہٹ سے بولا:

اچھا بتاؤ مجھے معاف کر دیا ہے۔؟"

وہ اب بھی خاموش رہی۔ کہتی بھی کیا۔

"پھر تو نیند نہیں آ رہی؟"

اور جواب میں وہ دھیرے سے ہنس دی۔

"کیا کر رہی تھیں؟"

"پڑھ رہی تھی"۔

"پڑھائی کیا اتنی ضروری ہے کہ رات بارہ بجے بھی بیٹھ کر پڑھا جائے؟"

"کل ٹیسٹ ہے۔ اور آ گئے Annual Exams"

"اوہ۔ جیسی پیپرز دیکھتی رہتی ہو۔" وہ یوں ہی اُسے چھیڑنے کو بولا جبکہ سٹوڈنٹ لائف میں وہ جیسے پیپر ہوتا تو بھی ایک ضروری کام سمجھ کر پکچر جا کر دیکھ آتا۔

"ایک پکچر سے کیا ہوتا ہے؟"۔

"بڑی لولڈ ہو"۔

"پھر بھی نہیں دی۔"

"پھر مجھ سے کیوں ڈرتی ہو؟"

اور اُسکی سانسیں پھر غیر متوازن ہونے لگیں۔

"اچھا گھبراؤ نہیں۔ بند کرتا ہوں۔ تمہارا ٹائم ویسٹ ہو رہا ہے۔

شب بخیر...."

"شب بخیر"۔ ثنائی نے بھی دھیرے سے کہا۔

اور ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ تھوڑی دیر کتاب پر نظریں دوڑاتی رہی۔

"تم نے مجھے ڈانٹا نہیں؟" "اچھا بتاؤ مجھے معاف کر دیا ہے؟"۔

ساتھ ہی اُس کا سراپا اُسکی نظروں میں گھومنے لگا۔ پھر اُس نے سر جھٹکا۔ پھر سے کتاب میں جذب ہونے کی کوشش کی۔ تھوڑی دیر تک کامیاب بھی رہی۔

"بڑی بولڈ ہو۔ پھر مجھ سے کیوں ڈرتی ہو؟" پھر وہی خیال! اُس نے

کتاب بند کردی ۔ خواہ مخواہ رات گنوانے سے فائدہ ؟ ۔
لائیٹ آف کی ۔ اور بستر میں گھسی ہی تھی کہ یکبار گی فون کی گھنٹی بج اٹھی
ساتھ ہی امی کا دل بے ترتیبی سے دھڑک اٹھا ۔ اُسی کا تو نہیں تھا ؟ ہاتھ بڑھا
کر اس نے ریسیور اٹھا لیا ۔ نہیں ۔ یہ تو بابا جان کا تھا ۔ امریکہ سے ۔ بابا جان
کی کال تھی امریکہ سے ۔ اس کے باوجود ۔ اُسے کچھ مایوسی سی ہوئی تھی شاید ۔
یا محض وہم تھا یہ اس کا ۔ بہرحال وہ بابا جان سے باتیں کرتے ہوئے سب بھول
بھال گئی ۔

۱۹

وہ PARTIES mix میں بہت کم جایا کرتی تھی ۔ بلکہ جب تک
وہ سولہ سال کی نہیں ہوئی تھی ۔ بابا جان اُسے کبھی mix GATHERINGS
میں ساتھ لے کر نہیں گئے تھے ۔ وہ تین سال سے انہوں نے اجازت دے دی تھی ۔
مگر ایسا ہوتا بہت کم تھا کیونکہ اکثر اوقات بابا جان ملک سے باہر ہوتے اور
اکیلے میں اُسے خود مکس پارٹیز اٹینڈ کرنا اچھا نہیں لگتا تھا ۔
مگر آج تو بابا جان کے معتبر دوست ملک سرور نے اتنے اصرار سے بلایا
تھا ۔ کہ باوجود سو بہانوں کے وہ انکار کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی امتحان کا
بہانہ ۔ ڈرائیور چھٹی پر تھا یہ بھی بہانہ خوب تھا ۔ بابا جان گھر پر موجود نہ تھے ۔
" میں جو تمہارے باپ کی جگہ ہوں " ۔ کہہ کر انہوں نے اس کا آخری بہانہ

بھی ناکامیاب بنا دیا تھا۔

"فصیح احمد نہیں ہیں بیٹی! تو تمہیں اُن کا خلا پورا کرنا ہوگا۔ ورنہ تمہارا انکل تم سے ناراض ہو جائے گا"۔ ارتکاز بولتے ہوئے بھی اُن کے لہجے سے شفقت کی مہکار چھلک آرہی تھی۔

"اوہ! نہیں انکل میں آجاؤں گی"۔ اُسے حامی بھرنا ہی پڑی۔

اُس نے فون کرکے اپنے وکیل کی گاڑی منگوائی، بابا جان کا ڈرائیور ہمیشہ اتنا ہی عرصہ چھٹی کرتا۔ جتنا بابا جان باہر گزارا کرتے تھے۔ وہ بابا جان سے شکایت بھی کرتی مگر وہ مسکرا کر ٹال دیتے۔

"بیٹے زیادہ سختی کرنا اچھی بات نہیں۔ اُسے بھی اپنے بچے یاد کرتے ہوں گے۔ جس طرح تم مجھے یاد کرتی ہو؟ اور

وہ مسکرا کر رہ جاتی۔ شانی کا ڈرائیور آج ہی چھٹی لے کر گیا تھا کچھ گرم کپڑے خرید کر اپنے بچوں کو سنبھالنے بیس میل پر واقع اپنے گاؤں گیا ہوا تھا۔ کل سارا دن گزار کر اگلے دن واپس آنا تھا۔

اُس نے سبز رنگ پر سرخ رنگ کا چیک گرم فلیپر اور کوٹ پہنا۔ بالوں کا سادگی سے جوڑا بنا کر اوپر سے کپڑوں کا ہم رنگ خوبصورت سکارف باندھا اسی رنگ کے سمارٹ جوتے پہنے۔ لباس پر اپنی مخصوص خوشبو چھڑکی، اور باہر پورچ میں آکر کار میں بیٹھ گئی۔

"شانی بیٹی! سو ٹھیک واپس آئے گی۔ وکیل صاحب کو کچھ کام ہے۔ ڈرائیور کو وقت بتا دو مقررہ وقت پر لینے پہنچ جائیگا"۔ ماما نے اکیبار پھر تاکید کردی۔

" اچھا ماما "۔

" خدا حافظ " ماما نے کہا۔ اور

ہاتھ ہلا کر انہیں جواب دیتے ہوئے وہ کار میں بیٹھی گیٹ سے باہر نکل گئی

چند مہمان آئے بیٹھے تھے جن میں دو چار لیڈیز بھی تھیں. چند مقامی سرکاری

افسروں کی بیویاں جو عکس پارٹیز میں اکثر دکھائی دیتیں۔ اس کا ان کے ساتھ آنا جانا

تو نہیں تھا. مگر جان پہچان ضرور تھی۔ وہ

انہی کے قریب آکر بیٹھ گئی۔ دو مہمان اور بھی آ گئے۔ اسے کچھ مزہ نہیں آ

رہا تھا۔ انکل سرور کے اصرار پر وہ آ تو گئی تھی. مگر کچھ بور سی ہو رہی تھی۔

خواتین جہاں شادی شدہ اور عمر میں اس سے بہت بڑی تھیں۔ کوئی common

Topic نہیں تھا۔ اس کے پاس۔ اور بھی ایسی کوئی خاص موضوع [illegible]

کی بات نہیں تھی. مگر۔

" ورنہ تمہارا انکل تم سے ناراض ہو جائے گا " انکل کا پر خلوص لہجہ اسے

یاد آیا۔ اور

وہ دھیرے سے مسکراتے ہوئے سامنے دیکھنے لگی۔

جبھی انکل بائیں طرف کے دروازے سے ہال میں داخل ہوئے۔

" ہیلو شالی بیٹے۔ اچھا ہوا تم آگئیں ورنہ آج تمہارے انکل کی ناراضگی

یقینی تھی۔" انہوں نے شفقت سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

" تم جانو بیٹی! میں پورا مہینہ لاہور گزار آیا۔ آج تیسرا دن ہے واپس پہنچے۔

نئے ڈی سی پوسٹ ہو کر آئے ہیں۔ میں بلا نہیں سکا تھا۔ آج وقت نکال ہی لیا۔
سوچا تم بھی آجاؤ گی۔ شفیع احمد کے پروگرام کا بھی پتہ چل جائے گا تم سے۔"
پھر انہوں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ "مہمان تقریباً سبھی آ گئے ہیں۔ ڈی سی صاحب
بھی بس پہنچتے ہی ہوں گے۔ تم بیٹھو بیٹی! میں ذرا شیخ ارشد سے دو دو ہاتھ
کر آؤں۔" وہ پچاس پچپن سالہ شیخ ارشد کو آتے دیکھ کر ان کی طرف بڑھتے
ہوئے مسکرا کر بولے

وہ پھر ہولے سے مسکرا دی۔
انکل نے بہت بشاش طبیعت پائی تھی۔ ساٹھ سال کے قریب عمر تھی۔
مگر مزاج طبیعت کا خاصہ بن چکا تھا۔
"سنا ہے نئے ڈی سی بہت اچھے انسان ہیں"۔ قدرے فاصلے
پر بیٹھے ایک صاحب کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔
"ارے۔ تو کیا آپ ملے نہیں ہیں ان سے؟" دوسرے نے جواب دیا
"میں تو ملا ہوں۔ حقیقتاً بہت شریف اور ملنسار ہیں۔ امیر غریب سے یکساں برتاؤ
خوش اخلاق۔ خوش مزاج۔ میں تو کہتا ہوں کم ہی ڈی سی ایسے آئے ہوں گے یہاں۔"
ندرت بھی ان کی گفتگو سن رہی تھی۔
ڈی سی سے پہلے ... قبل اس کی بھی باتیں ہوئی تھیں فون پر۔ تب سے ہی
وہ بہت اچھے لگے تھے۔ پھر ان کا بیٹا۔ بالواسطہ یا بلاواسطہ۔ اچھا یا برا۔
کچھ نہ کچھ رشتہ اس کے ساتھ بھی تو تھا۔ منچلوں جیسی حرکتیں کرنے والا۔ اسی
ڈی سی کا بیٹا۔ آج کل اپنی مشہور شخصیت کی طرح ... کن باتوں کی کرنے لگا تھا۔

وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

واقعی اُس کی شخصیت متاثر کرنے والی شخصیتوں میں سے تھی۔

لمبا قد، چوڑے شانے، سرخی مائل گھلتا ہوا گندمی رنگ، بڑی بڑی بہت بولتی بے حد خوبصورت آنکھیں پُرکشش نقش و نگار، گھنے ڈارک براؤن بال۔ موسم کے لحاظ سے بہترین سوٹ زیب تن کئے وہ ہال کے دروازے سے اندر داخل ہوا تھا۔

"ڈی سی صاحب آگئے ہیں" کسی نے اُس کے پاس سے ہی کہا تھا۔ اور وہ چونک کر سامنے دیکھنے لگی تھی۔ کافی دیر تک کوئی اندر نہ آیا۔ تو کیا وہ اکیلا ہی آیا تھا؟ بہیرہ۔

"ڈی سی صاحب آگئے ہیں" جس شخص نے کہا تھا وہ اُس سمت دیکھنے لگا ہال میں موجود سبھی حضرات کھڑے ہوئے تھے۔ اور وہ ایک ایک سے باری باری ہاتھ ملا رہا تھا۔ انکل سرور اُس کے ساتھ ساتھ تھے۔ اور ہر ایک سے اس کا تعارف کرائے جا رہے تھے۔

"یہ شان صبیح احمد ہیں۔ یہاں کے رئیس صبیح احمد صاحب کی صاحبزادی" اُس کے قریب پہنچتے ہوئے انکل سرور نے اُس کا بھی تعارف کرا دیا۔

شانی نے دیکھا ایک پل کو وہ جیسے ٹھٹھک سا گیا تھا۔ "اور شانی یہ ہیں ڈی سی صاحب ہیں۔ تمہارے پاپا کے بزنس میں تو رہتے ہیں۔ لیکن ارے ... " انہیں جیسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ "تم کہاں مل ہو گی؟ صبیح احمد تو ہیں نہیں یہاں ... "

"آپ سے مل کر خوشی ہوئی" اس کی متحیر آنکھوں میں متجسس نظروں سے دیکھتے

ہوتے اُس نے کہا تھا۔

اور — شانی کو محسوس ہوا۔ وہ پیچھے ہی پیچھے کھسکتی چلی جا رہی ہے۔
وہ مسکراتے ہوئے ملک سرور کی ہمراہی میں آگے بڑھ گیا تھا۔ اور شانی
کو لگا تھا۔

آج کا مذاق سب سے بڑا تھا۔ آج اُس نے آسے گزرتے ہوئے دنوں سے
کہیں بڑھ کر بیوقوف بنایا تھا۔

تمام لوگ میز کے گرد سمٹ آئے تھے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ قریب آگئی
تھی۔ خالی پلیٹ ہاتھ میں لیے وہ جیسے اب بھی سوچوں میں کھوئی ہوئی تھی۔
"کیا سوچ رہی ہو؟" جانے کس طرح؟ وہ اتنے سارے لوگوں کی نظریں بچا
کر اُس کے پاس چلا آیا۔

بغیر کچھ کہے اپنی بھری ہوئی پلیٹ میں سے روسٹ کا پیس، چاول اور سلاد
اُس کی پلیٹ میں ڈال دیئے۔ اور خالی پلیٹ لیے اُس کے کسی جواب کا انتظار کیے
بغیر وہ جلدی سے آگے بڑھ گیا۔

کتنی اپنائیت سے اُس نے یہ سب کیا تھا۔ اتنے بڑے مذاق کے بعد اُس
سے بے طرح ناراض ہونے کے بعد بھی وہ ہولے سے مسکرا دی۔

اُس نے دیکھ لیا تھا کہ وہ خالی پلیٹ ہاتھ میں پکڑے کب سے کھڑی
ہے۔ بجائے پوری ڈشیں اُٹھانے کے وہ چند چیزیں اپنی پلیٹ میں
نکال کر اُس کے لیے لے آیا تھا۔ کوئی ڈش اُٹھا کر آسے پیش کرتا۔ تو یقیناً لوگوں
کی نظروں کا مرکز ہو جاتا۔ لوگ۔

جو اُسے طرح طرح کے کھانے پیش کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے
جانے کی کوشش میں کوشاں نظر آ رہے تھے ۔ ملک سرور کے علاوہ بھی کئی لوگ تھے
کی بسی اور دیگر لذیذ ڈشیں اُسے پیش کرنے میں مصروف تھے ۔ پھر شاہ جی نے دیکھا ۔
اُس نے روسٹ کا ایک پیس پلیٹ میں لیا تھا ۔ اور مختلف لوگوں سے باتیں کرتے
ہوئے وہی کھانے پر اکتفا کیا تھا ۔

تو ڈی ۔ سی کا بیٹا بذاتِ خود ڈی سی تھا ؟ ۔

"دراصل ۔ میں فیل ہو گیا تھا ۔ میں بی اے میں پڑھتا ہوں ۔" اُس کے کہے
ہوئے الفاظ اُس کے کانوں میں گونجنے لگے ۔

کتنا بہت سا کھانا لایا تھا اُس کے لئے ؟ اور خود ایک ہی پیس روسٹ
کا کھائے جا رہا تھا ۔

کھانے کے بعد وہ واپس اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئی ۔
اُس کے تو محسوسات عجیب سے ہو رہے تھے ۔

"میرے پاؤں میں گھنگرو بندھا ہے تو پھر میری چال دیکھ لے ۔" کمر میں کس
کر بندھا ہوا سکارف اور زور سے ٹھمکا لگاتا ہوا ہی شخص اُسے یاد آیا ۔
"پتنگ اُڑائیں گی ؟" بندی کے چھوٹے سے بیٹے نے پتنگ کی ڈور اُس کے ہاتھ
میں تھماتے ہوئے بولا تھا ۔

پھر اُسے یاد آ گیا تھا کہ اُس نے سیب مارا تھا اس کی کمر میں ۔
اور پھر دونوں ہاتھ اس کی نیلی پڑی کمر پر مالش کرتی رہی تھی ۔
سینڈل کے دھماکے بھی اُسے یاد آ گئے ۔

سکوڈرپردہ بین اس کے قدموں میں آن گرا تھا۔ کبیر اسے اچانک یاد آیا۔ اس نے اس کے خلاف اسکی شکایت اس کے باپ کو کردی تھی۔
توکیا وہ خود اپنا باپ بنا اپنی شکایت اسکی زبانی سن رہا تھا؟۔ وہ انگشت بدنداں رہ گئی۔
"میں نے تمہارے ساتھ مذاق کیا تھا۔ تم نے اتنا سیریس لے لیا ہے؟"۔
اسے گھرسے تھامے وہ اسکی طرف کی سیڑھیاں چڑھتا ملائمت سے کہہ رہا تھا۔
"بتاؤ مجھے معاف کردیا ہے؟"۔ ابھی اس رات ہی وہ فون پر پوچھ رہا تھا۔
جیسے اپنے ذہن کے ساتھ اسکی حرکتیں۔ اس کی باتیں اس کے تصور کے پردے پر آتی اور جاتی رہیں۔
"شان بیٹے!" ملک سرور اس کے پاس کھڑے اسے کچھ کہہ رہے تھے۔
"جی انکل"۔ وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔
ان کے ساتھ ہی وہ بھی دلکش مسکان ہونٹوں پہ لئے کھڑا تھا۔
"تمہاری ماما کا فون آیا ہے کہ میں تمہیں گھر پہنچا دوں۔
وکیل صاحب کی گاڑی ذرا دیر سے نارمل ہوئی۔ مگر ڈی ایس صاحب کہتے ہیں کہ وہ تمہیں گھر چھوڑتے جائیں گے"۔
"جی؟۔ انکل۔ ۔ ۔ ؟"۔ اس کی عجیب سی پوزیشن ہوگئی۔ نہ انکل کے سامنے انکار کرسکتی تھی۔ نا ہی اقرار کرنے کو جی چاہتا تھا۔ اتنا زبردست دھوکہ بھی تو دیا تھا اس نے۔

"میں چھوڑ جاؤں گا انکل۔ آپ فکر نہ کریں"۔ اُس نے شانی کے دیکھا دیکھی ملک سرور کو یوں اپنائیت سے "انکل" کہا۔ کہ انکل جھوم ہی تو اُٹھے۔

"شکریہ بیٹے"۔ انہوں نے کامران کے کندھے پہ شفقت سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

اور شانی نے دیکھا جس دوران وہ سوچوں میں گم تھی۔ تقریباً آدھے لوگ جا چکے تھے۔

"چلیئے"۔ وہ سنجیدگی سے شانی سے مخاطب ہوا۔

اور نہ چاہتے ہوئے بھی جز بز سی ہوتی وہ دروازے کی سمت بڑھی۔

کامران نے بھی سب سے ہاتھ ملایا۔ اور اُس کے پیچھے پیچھے چلا آیا۔

"بیٹھو بیٹی"۔ انکل سرور نے اُس کے لیے کامران کی کار کا پچھلا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

وہ آہستہ سے سیٹ پر جا بیٹھی۔ انکل سرور نے اس کا دروازہ بند کر کے کامران سے ہاتھ ملایا۔

"خدا حافظ"۔ کامران نے کہا۔ اور ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔

انکل ایک قدم پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ کامران نے گاڑی سٹارٹ کر دی۔ اور اُن کی طرف ہاتھ ہلاتے ہوئے آگے چل دیا۔

گیٹ سے باہر نکل کر تھوڑے فاصلے پر اُس نے کار روک دی۔ اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ وہ حیرت سے اُسے دیکھنے لگی۔ "آگے آجاؤ" پچھلی طرف آکر اُس کا دروازہ کھولتے ہوئے وہ بلا تمہید بولا۔

"نہیں ٹھیک ہے"۔ وہ سپاٹ سے لہجے میں بولی۔

"یہاں ٹھیک نہیں ہے" وہ اُسے ہاتھ سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولا۔

"میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی" کار سے اترتے ہی وہ بولی۔ ناراضگی کے ساتھ ساتھ اس کا چہرہ بھی پھولا ہوا تھا۔

"اب تو آگئی ہو" خوشگواری سے ہنستے ہوئے اُسے تقریباً گھسیٹتے ہوئے بار کے پیچھے سے گھوم کر وہ اگلی طرف آیا۔

"تشریف رکھئے" دروازہ کھول کر اُسے زبردستی بٹھاتے ہوئے اُس نے کہا۔ اور دروازہ بند کر کے سامنے سے گھوم کر اپنی سیٹ پر آگیا۔

"آج پچھلے کئی دنوں سے کہیں زیادہ ناراض نظر آرہی ہو۔ کیا بات ہے؟" ہنسی ضبط کرتے ہوئے اُس کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔

اور اُس نے رُخ خاموشی سے کھڑکی کی طرف پھیر لیا۔

"اوہ۔ واقعی ناراض ہو۔ معاف نہیں کرو گی؟" وہ آہستہ آہستہ موڑ کاٹتے ہوئے کہتا گیا۔

"تم نے پہلی خطائیں معاف نہیں کیں۔ یہ کیا معاف کرو گی؟"

"بھئی کچھ تو کہو نا؟" اپنا سر اس کے کندھے سے ٹیکتے ہوئے اس نے خوشدلی سے کہا۔

مگر وہ چپ چاپ اندھیرے میں باہر گھورتی رہی۔

وہ بھی خاموش ہو گیا۔ دلنشیں مسکراہٹ البتہ ہونٹوں پر اب بھی بکھری چلی آ رہی تھی۔

کار سڑک کی گولائیاں گھومتی دھیرے دھیرے چڑھائی پر چڑھتی جا رہی تھی۔ اب وہ اونچائی پر بنے چھوٹے چھوٹے کچے مکانات کے دامن ہی سے گزر رہے تھے۔

تبھی ایک بڑا سا کتا بھونکتا ہوا اچانک ہی اچھل کر شانی کی کھڑکی تک آیا۔

"ہائے اللہ" وہ بے طرح گھبرا کر کامران کی طرف سمٹ آئی۔

"شیشہ چڑھا ہوا ہے" وہ ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولا۔

کتا اب بھی بھونکتا ہوا ساتھ ساتھ بھاگا چلا آ رہا تھا۔ موڑوں کی وجہ سے کار کی رفتار بھی دھیمی تھی۔ کتے کا چہرہ بند شیشے کے ساتھ لگا واقعی بھیانک لگ رہا تھا۔

مزید سمٹتے ہوئے اس نے ڈیش بورڈ تھام لیا۔

"گھبراتی کیوں ہو شیشہ تو بند ہے" وہ اس کی طرف جھکتے ہوئے نرمی سے بولا۔

مگر

دکھتی رہیں تھیں، رکھشے کا بھیانک چہرہ مسلسل ساتھ ساتھ رواں تھا۔ جلد ہی
یقیناً دیکھ کر اُس نے چہرہ اپنی گود میں چھپا لیا۔
وہ واقعی بہت چھوٹی تھی۔ بے حد معصوم۔ ایک پل کو اُس نے پیار سے
اُسے دیکھا۔ چہرہ زینہ سے اس کا سر اپنے پہلو سے لگا لیا۔
"ڈرو نہیں۔ میں جو تمہارے ساتھ ہوں"۔ اُس کے لہجے میں پیار امنڈا
پڑتا تھا۔
اور وہ ہر خطرہ بھلا کر یک دم ہی اُس کا ہاتھ جھٹک کر دور ہٹ گئی۔
وہ دھیرے سے ہنس دیا۔
مکانات کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ اور کتا بستی کا حاصل کے بعد اپنے ہی
حدود میں ہنوز بھونکتا پیچھے رہ گیا تھا۔
"تمہارے بابا جان کب آ رہے ہیں؟" تھوڑے توقف کے بعد وہ سنجیدگی
سے بولا۔
"نہیں معلوم"۔ کھڑکی سے اُس پار اندھیرے میں گھورتی وہ پھولے پھولے
منہ کے ساتھ بولی۔
"اور امتحان کب ہو رہے ہیں؟" اُس نے پھر پوچھا۔
وہ خاموش رہی۔ اتنا زبردست مذاق کرنے کے بعد وہ کس اطمینان سے
اُس کے ساتھ باتیں کیے جا رہا تھا۔
"ابھی بتا دو نا کب شروع ہو رہے ہیں؟ کب ختم ہوں گے؟"
"نہیں پتہ"۔ وہ ہنوز رُخ پھیرے اُسی انداز میں بولی۔

"تم تو سچ مچ ناراض ہو" سٹرک پر نظریں جمائے اُس نے اس کا سیٹ پر رکھا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

اور شانی کو جیسے بجلی چھو گئی۔ اُس نے اُس کا ہاتھ زور سے جھٹکتے ہوئے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"مائی ڈئیر" وہ شرارت سے سٹیرنگ پر جھکا۔ "کلائی ایسی نازک — اور اتنے زور کا جھٹکا۔ ویسے اے مس! یہ تو بتاؤ! ایف اے کے بعد کیا کرو گی؟"

اس کی پڑھائی سے متعلق تمام معلومات اُسے نعیم سے پتہ چلتے رہتے تھے۔

اور شانی مزید کھڑکی کی طرف سمٹ گئی۔ جواب کچھ نہیں دیا۔

"اُفوہ۔ کیا چیز ہو؟" وہ جھنجھلا سا اُٹھا۔ "بولتی کیوں نہیں ہو۔ میں نے کہہ تو دیا تھا سب میں نے مذاق کیا تھا۔ تمہیں تنگ کرنے کو یہ سب کرتا تھا۔ یہاں کا چارج لیتے ہی میں نے چاہا تھا تمہارے بابا جان سے ملوں۔ میں نے فون پر تم سے ان کے متعلق دریافت کرنا چاہا۔ تو تم نے تڑخ کے ہی کہا۔

"آپ کا نام لوفر ہے مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔" پھر میں بھی لوفر بن گیا۔ تمہیں چھیڑا۔ تنگ کیا۔ تم چڑ گئیں اور واقعی تنگ آ گئیں۔ تو میں نے مذاق بھی ختم کر لیا۔ تم سے معافی مانگ لی۔ سوچا تم نے معاف کر دیا ہے۔ مگر..." وہ قدرے رکا۔ اُس کی طرف دیکھا۔ اس کا رخ کھڑکی کی طرف نہیں تھا۔ وہ سامنے دیکھ رہی تھی۔

"آج پچھلے دنوں سے کہیں زیادہ معقول لگتی ہو۔ اتنی دیر سے بکواس کیے جا رہا ہوں۔ جواب ہی نہیں ملتا۔" وہ جھنجھلایا سا سامنے دیکھتا

ڈرامہ کر گیا۔

حمیٰ خان کو یاد آیا۔ کچھ عرصہ قبل واقعی یہ واقعہ پیش آیا تھا مگر اس طرح کا تھی کے ذہن سے بیسے کوئی شخص بار بار رنگ کر کے اُسے تنگ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تجابانی تو وہ بیٹھی ہی تھی۔ جوں ہی کامران سے بات شروع کی۔ اُس نے دل کچھ اگل دیا۔ جس کا درحقیقت وہ پہلا شخص مستحق تھا۔

تو یہ سب اُس ایک جملے کا ردعمل تھا۔ یہ سوچتے سوچتے وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

اُس کی جھنجھلاہٹ پر اُسے ہنسی آرہی تھی۔ سامنے دیکھتے ہوئے اُس نے نظریں مشترکہ بر جما دیں۔

"اب بھی نہیں بولو گی؟" رخ اُس کی طرف کرتے ہوئے اُس نے پوچھا۔ اُس کے لہجے میں رعب تھا۔ حکم تھا۔

اور شانی کوئی جواب دیے بنا اُس کی طرف دیکھنے لگی۔

"ناراض ہو اب بھی؟" کار ایک طرف روکتے ہوئے وہ اُس کی طرف مڑتے ہوئے پوچھنے لگا۔ لہجہ اب بھی ویسا تھا۔ بارعب سا حاکمانہ سا۔

وہ واقعی مرعوب سی ہو گئی۔ کوئی جواب ہی نہ بن پڑا۔ بلکہ جھکائی خاموش ہی رہی کیسا لگا پریشان کیا تھا اُس نے اُسے۔ ناراض تو وہ ضرور تھی۔ مگر زیادہ۔

"تنگ کیوں کر رہی ہو۔ بولو نا" وہ مزید جھنجھلا کر بولا۔ لہجہ پہلے سے کئی گنا بارعب اور حاکمانہ ہو گیا۔

عجیب تھا۔ تنگ تو اُس نے کیا تھا۔ بجائے پشیمان ہونے کے اُلٹا جھنجھلا

جا رہا تھا۔ رعب ڈال رہا تھا۔ حکم چلا رہا تھا۔ جانے کیوں؟ اُس کی آنکھیں چھلک
اٹھیں۔ پلکیں تیزی سے گرنے اٹھنے لگیں۔

"چپ رہو۔۔۔" دونوں بازو سینے پہ باندھتے ہوئے وہ گہری سانس لے کر بولا۔

۔۔۔۔ ہوتے ہوئے آنسو ڈھلک کر اُس کے خوبصورت گالوں پہ آ رہے۔

چند ثانیے وہ یونہی اُسے تکتا رہا پھر ہاتھ بڑھا کر آہستہ سے اُسے اپنے سینے
سے لگا لیا۔

"تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو شانی۔" بیتے جو ڈھلکے ہوئے اُس کے [illegible] پہ سے آنسو
اپنے ہونٹوں میں اٹھاتے ہوئے وہ دھیرے سے بولا۔

شانی مزاحمت کرنے لگی۔

"پلیز شانی۔" اُس کی دونوں بھیگی بھیگی آنکھوں پر پیار کرتے ہوئے وہ تڑپ
کر بولا۔ "I love you, I am mad in love with you."

اُس نے اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ پھر دھیرے دھیرے کہتا گیا۔

"مجھے تم سے پیار ہے شانی۔ کب سے ہے؟ کب ایسا ہوا؟

کچھ پتہ نہیں۔ بس اتنا یاد پڑتا ہے کہ جب سے آخری چھٹیوں میں ایسا
تھا تم مجھے اچھی لگنے لگی تھیں۔ اچانک ہی۔ اور بہت شدت سے۔۔۔۔" جانے کیا
کیا کہہ رہا تھا وہ؟

شانی اپنے کو اُس کی گرفت سے چھڑا کر کھڑکی کے پاس جا بیٹھی تھی۔

"تنگ بھی کرتی ہو، پھر روتی بھی ہو۔" کار اسٹارٹ کرتے ہوئے اس کا سیٹ
پر رکھا ہاتھ دباتے ہوئے اُس نے کہا۔

"اتنی سی ہو۔" اس نے بائیں ہاتھ کی دو انگلیوں سے بالشت بھر کا فاصلہ بنایا۔ "شوکیس میں سجنے والی گڑیا جیسی ... مگر پتہ ہے، تم بھی اتنے بڑے آدمی کو ناراض کر دیا ہے۔" خوش دلی سے ہنستے ہوئے وہ ڈرائیو کرتا گیا۔

"اب تو ناراض نہیں ہو نا؟" ان کے گیٹ میں داخل ہوتے ہوئے اس نے پھر پوچھا۔

وہ خاموشی سے اسے تکے گئی۔

"میں پھر ہاتھ جوڑتا ہوں۔" پورچ میں کار روکتے ہوئے اس نے واقعی مسکراتے ہوئے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

وہ دھیرے سے مسکرا دی ... انداز میں۔

کامران آ کر سامنے سے گھومتا اس کی طرف آیا۔

دروازہ کھولا۔ اور وہ باہر نکل آئی۔

"شب بخیر۔" کامران نے ہولے سے کہا۔

کوئی جواب دیئے بنا وہ اب بھی اسے دیکھ رہی تھی۔

ناراض سی۔ شاکی سی نظروں سے۔

پورچ کی تیز روشنی میں اس نے دیکھا۔ کچھ دیر قبل رونے سے اس کی شربتی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

ناراضگی کے سائے بھی نمایاں ہو رہے تھے۔

اور۔ اور۔ شاکی انداز مزید گہرا ہو گیا تھا۔ اتنے سارے حسین جذبوں کی تاب نہ لا کر وہ بے بسی سے مسکرا دیا۔

کار کے سامنے سے گھومتا واپس اپنی سیٹ پہ آیا۔ اور اُس کی طرف ہاتھ ہلاتے ہوئے باہر جانے والی گیٹ کی طرف ہو لیا۔

دن تیزی سے گزرنے لگے۔ ڈنر کے بعد سے اُس پہ راز دل کھولنے کے بعد تو وہ جیسے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اُس کیلئے کیسا کیسا دل مچلتا تھا۔ اُس سے ملنے کو، اُس سے باتیں کرنے کو۔

مگر وہ موقعہ ہی نہیں دے رہی تھی۔ اوّل تو ٹیرس پہ کم ہی آتی جبی تو کتاب ہاتھ ہی لئے۔ اور سنجیدگی سے محو مطالعہ نظر آتی۔

رات دیر تک اُس کے کمرے میں لائٹ آن رہتی۔ یقیناً امتحان قریب تھے۔ اور وہ تیاری میں منہمک۔

مگر۔

وہ اپنے دل کا کیا کرتا؟ اُسے جو کیسی کل چین نہیں آ رہا تھا۔

آج سات دن کے طویل سرکاری دورے کے بعد وہ گھر پہنچا تھا کیسا کیسا بیقرار ہوا تھا وہ یہ سات دن۔ جیسے صدیاں ہوں سات۔ تب اُسے احساس ہوا۔ وہ بنی نہ ملتی، نظر آتی نہ آتی۔ وہ گھر پہ ہوتا تھا تو اُس کی قربت کے احساس سے مطمئن ضرور رہتا تھا۔

ڈھائی پانچ بج چکے تھے۔ دھوپ ڈھل چکی تھی۔ اور عظیم امتحان کی تیاری

کے لیے ہوسٹل جا چکا تھا۔ اُس نے بستر میں ہی ایک کپ سٹرونگ سی کوفی پی
پھر کپڑے بدلنے اُٹھ کھڑا ہوا۔ ڈریس اپ ہوتے ہوتے اس کی نظریں کھڑکی
سے اُس پار پڑیں۔

شانی بیڈ بیس پہ رکھے ایک پھولوں کے گملے کے سامنے دو زانو بیٹھی جیسے
محو تھی بالکل۔

آج وہ ضرور اُس سے ملے گا۔ باتیں کرے گا۔ آج اس کے ہاتھ میں کتاب
نہیں تھی۔ گملے میں لگے پودے کو محویت سے دیکھے جا رہی تھی۔ پڑھائی سے اُکتا کر
فریش ہونے کا یہ اچھا انداز تھا۔

کوٹ پہنتے پہنتے اُس نے ایک نظر قدِ آدم آئینے پہ ڈالی۔ اور بڑے بڑے
قدم اُٹھاتا اپنے باتھ روم کا بیرونی دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

برآمدے کی کونے والی سیڑھیاں اُتر کر اندرونی لان کے کنارے چلتا اب
وہ اپنی حدود کے آخری سرے پہ گامزن تھا۔

شانی واقعی محو تھی۔ رُخ اگرچہ اُس کی طرف تھا مگر پھر بھی اُس کی آمد
کا احساس تک نہ ہوا۔

"ہیلو میم صاحب" ریلنگ کے قریب پہنچ کر اُس نے ہولے سے کہا۔

مگر اُس کے باوجود وہ جیسے اُچھل کر رہ گئی۔ وہ دل ہی دل میں ہنس دیا۔
ہاں۔ تو وہ خاصی واقع ہوئی تھی۔ یہ تو اُسے پہلے ہی معلوم تھا۔

شانی نے نظریں اُٹھا کر دیکھا۔ وہ ریلنگ پہ سینہ ٹکائے لوفر ہونٹوں پہ مسکراہٹ لیے
مشتاق نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

ایک پل کو اُس کی آنکھوں میں جیسے قندیلیں سی جل اُٹھیں۔ خوبصورت لب متبسم ہو گئے۔ مگر۔ دوسرے

ہی لمحے جلتی قندیلوں کی جگہ ناراضگی نے لے لی۔

ہونٹ البتہ اب بھی دھیمی مسکان لئے ہوئے موجود تھے۔

اُس کے "ہیلو" کا جواب دیئے بنا وہ اپنے سامنے لگے ننھے ننھے لال لال

لال پھولوں کو دوبارہ تکنے لگی۔ "بعض چیزیں بڑی قسمت والی ہوتی ہیں" اُس کے انداز پہ حیرت سے مسکراتا وہ کھیر بولا۔

وہ جھکے فرش پہ بیٹھی اُس کی اَن سُنی کرتے ہوئے اب بھی پھولوں کو دیکھ رہی تھی۔

"اے میڈم" قریبی پودے سے بڑا سا پھول توڑ کر اُسے متوجہ کرنے کو اُس پہ پھینکتے ہوئے وہ پھر بولا۔

گود میں گرے پھول کو دھیرے سے پرے ہٹاتی وہ خاموشی سے اُسے دیکھنے لگی۔

"مجھ سے اچھی ان پھولوں کی قسمت ہے جنہیں کتنی دیر سے بیٹھی تم پوجے جا رہی ہو" اُس کی آنکھوں میں دیکھتے دیکھتے وہ کہہ رہا تھا۔

اُس کی نظروں کی تاب تو وہ کبھی نہ لا سکی تھی، پلکیں گرانے اُٹھانے لگی۔ چہرہ مزید گلابی ہو گیا۔ "پتہ ہے ان پھولوں کو کیا کہتے ہیں؟" قدرے توقف کے بعد وہ اچانک بولا۔

اور وہ اپنی بے تحاشہ خوبصورت آنکھیں پوری کھول کر اُسے دیکھنے لگی۔

اُسے تو واقعی ان ننھے منے لال لال پتیوں والے پھولوں کا نام نہیں آتا تھا۔

البتہ اُسے بہت کھٹکتے۔ مالی سے خاص طور پہ کہہ کر اُس نے یہ گملا ادھر پیچھے رکھوایا تھا۔

لمبی لمبی سوکھی کانٹے دار ڈنڈی نما شاخوں پہ جابجا لگے یہ لال لال ننھے سے پھول اُسے بے حد پسند تھے۔ چھوٹی سی جان — دو دو پتیوں پہ مشتمل سوکھے کانٹوں میں بسیرا کئے ہوئے تتلی جیسے۔

"تمہیں معلوم؟" اُس کی آنکھوں میں دیکھتے دیکھتے اُس نے پوچھا۔

اور اُس نے اُسی شاکی انداز میں سر نفی میں ہلا دیا۔

"میں بتا دوں؟"

وہ خاموشی سے اُسے دیکھنے لگی۔

"یہ پھول لوفر ہے"۔ وہ آہستہ سے ہنس دیا۔

اور وہ بھی — نہ چاہتے ہوئے بھی خوبصورتی سے ہنس دی۔

"شکر ہے کفر ٹوٹا خدا خدا کرکے"۔

اور وہ مزید ہنس دی۔

"KISS ME QUICK"۔ وہ اُس کی آنکھوں میں بغور دیکھتے ہوئے بولا۔ "ان پھولوں کا نام ہے"۔ اُس نے جلدی سے پھولوں کی طرف اشارہ کیا۔ مگر۔

اس کے باوجود اُس کی پلکیں یکبارگی جھک گئیں۔

اور چہرہ کانوں کی لوؤں تک سرخ ہوگیا۔

کامران محظوظ ہوئے بنا نہ رہ سکا۔ کیسا آن گھیرا تھا اُسے۔

"دو Lips ایسا جیسے بنے ہیں نا" وہ مزید بولا۔

اور شانی کے چہرے کی تپش میں مزید اضافہ کر گیا۔

"دیکھو اب اور زیادہ ناراض ہو جانا۔ پچھلی ناراضگی کافی ہے۔ میں نے صرف نام بتایا ہے تمہیں ان پھولوں کا جنہیں اتنے پسند ہیں تو نام بھی معلوم ہونا چاہیئے۔"

اور وہ اس کے انداز پر سر گھٹنوں پر ٹیکتے ہوئے مسکرا دی۔

"امتحان کب شروع ہو رہے ہیں؟" اگرچہ اسے ... معلوم ہو چکا تھا۔

بی اے کے امتحان میں صرف ایک ہفتہ رہتا تھا۔

وہ سر گھٹنوں سے اٹھا کر اسے کوئی جواب دیئے بنا اپنے ہاتھ کے خوبصورت ناخنوں کو تکنے لگی۔ "تو آج بھی نہیں بولو گی تم؟"

اور اس نے سر دھیرے سے نفی میں ہلا دیا۔

"اوہ — میں — میں —" مارے جھنجھلاہٹ کے وہ بول ہی نہ سکا۔

اور وہ لال لال منہ سے ہتھیلی کو چھیلتے ہوئے ہولے ہولے مسکرا دی۔

"ناراض ہو اب تک؟"

شانی نے اب بھی سر نفی میں ہلا دیا۔

"پھر؟"

وہ اب بھی چپ رہی۔

"آخر کیوں نہیں بولتی ہو؟"

اسے تو اس کی جھنجھلاہٹ میں مزہ آ رہا تھا۔ شاید بول ہی دیتی۔ آخر تو اُن ایسی کوئی دشمنی بھی نہیں تھی بس یوں ہی چپ سادھ کر اسے تنگ کرنا۔ اسے اچھا

لگے بیٹھا تھا۔ اُس کی چنچل حرکتوں کا بدلہ لینے کا یہ اچھا طریقہ ہاتھ آیا تھا۔

وہ اب بھی نہیں بولی۔

”نہ بولو۔ میں بھی دیکھوں گا کب تک نہیں بولتی ہو۔“ وہ مشتعل سا ہو گیا۔

اور وہ آتشیں لال لال ننھے منے پھولوں کے مزید قریب سمٹ آئی۔

”تم تو چبا کرو۔ میں جاتا ہوں۔“ وہ تنجھلایا یا جھنجھلایا باڑ کی پتیاں نوچتا وہاں سے چلا آیا۔

اُس نے تو ایسی چپ سادھ لی تھی۔ کہ اُس کی کسی بات کا جواب نہ دیتی۔ خاموشی سے گھنی خوبصورت پلکیں اٹھا کر اُسے گھورتی اور بس۔ یا پھر زیادہ سے زیادہ معصوم سے انداز میں سر کی ہلکی سی جنبش سے ”ہاں“ یا ”نہ“ کر دیتی۔

ماتھے پہ شکنیں۔ نظروں میں غصہ اور آواز میں ناراضگی۔ شاید اُس کی بے انتہا نزاکت کی نفی کرتے تھے۔ یا پھر

شاید وہ ان چیزوں کا بار اپنے نازک وجود پہ برداشت ہی نہ کر سکتی تھی۔

تبھی اُس کی چنچل حرکتوں کے لئے شاکی انداز لئے ہونٹ خفیف سے مسکرائے رہتے اور بس۔

کتنا انوکھا انداز تھا ناراضگی کا۔ نرالا۔ نایاب انداز۔

آج اُس کا پہلا پیپر تھا۔ اور حسب معمول وہ اُسے ”وش“ کرنے گیا تھا۔

نایاب گلابوں کا بڑا سا مہکتا گلدستہ ہاتھ میں لیتے وہ رات کی تاریکی میں ٹیرس کی طرف گیا تھا۔ اُس نے قریب جا کر تالی بجائی تھی، اور پھر تھوڑی ہی دیر میں اُس کا ٹیرس کی طرف والا دروازہ کھل گیا تھا۔

ساتھ ہی پہلے اُس نے دروازے میں سے سر ڈال کر باہر دیکھا تھا۔ اور پھر آنکھوں میں اداسی جلتے بجھتے دیپ لیے ریلنگ تک آ گئی تھی۔ چپ چاپ خاموش سی۔ "WISH You Good Luck" بلا تمہید بڑے بڑے مہکتے گلاب اُسے تھماتے ہوئے وہ دھیرے سے بولا تھا۔

ہاتھ میں لیتے ہی اُس نے اپنا چہرہ اُن بھیگے بھیگے تازہ تازہ گلابوں پر رکھ دیا تھا۔ اُن کی مسحور کن خوشبو سے وہ مسحور سی ہو گئی تھی۔ مگر —

بولی کچھ نہیں۔ بس پھولوں ہی کو تکتی رہی۔

"کل انگلش کا پیپر ہے؟" وہ بے سبب پوچھ رہا تھا۔

وہ خاموش رہی۔

وہ جانتا تھا پہلے سے۔ اُس نے سر کی جنبش بھی گوارا نہ کی۔

"پہلے بتاؤ! لڑو گی مجھ سے یا نہیں؟"

اور اُس نے سر سختی سے نفی میں ہلا دیا۔

اُس کی نفی میں "ہاں" ہوتی تھی۔ اُس کی "ہاں" میں "نا" ہوتی تھی۔

وہ مسحور سا اُسے دیکھتا رہا۔

"ایک بات کہوں؟"

خمار آلود نظریں اُس پر مرکوز ہو گئیں۔

"تمہاری کھلی پلکوں میں غصّہ ہوتا ہے۔ غصہ بھی نہیں۔ بلکہ جیسے خفا سی ہو
... مگر ..." وہ شوخ نظروں سے اُسے دیکھتا شرارت سے ہنس دیا۔ "مگر۔
جب کبھی کسی بات پر تمہاری پلکیں جھک جاتی ہیں۔ تو ... لگتا ہے ...
لگتا ہے ... تمہیں بھی کسی کا خیال ... آتا ہے ..." اُس نے چبا
چبا کر کہا۔

اور وہ چہرہ دوبارہ پھولوں پر رکھتے ہوئے پلکیں جھپکانے لگی "اچھا
اب اندر چلو۔ سردی بہت ہے اور تم۔ تم بہت نازک ہو۔ بات تو تم کرو گی
نہیں۔ خواہ مخواہ ٹائم ویسٹ کیا ہے تمہارا۔ اچھا بھئی آؤ۔
پاس ہونا اسی بار سمجھیں۔" وہ ہنستا ہوا وہاں سے چلا
آیا تھا۔

ان کے دو دن بیت چکے تھے آفس میں با مقصد بیٹھا وہ میز پر رکھے پن سے کھیلتے
ہوئے اُسی کے متعلق سوچ رہا تھا۔

"وہ پیپر دے کر آ چکی ہوگی۔ پیپر کیسا ہوا ہوگا۔؟"
یہ خواہش دل میں اُبھرتے ہی وہ جھنجھلا اُٹھا۔
انداز اگرچہ قاتل سہی۔ مگر بہت صبر آزما۔
اپنی محبت کے اظہار کے بعد تو وہ دیوانگی کی حد تک اُس کے لئے بیقرار
رہنے لگا تھا۔

وہ کچھ بولتی۔ بات کرتی۔ تو تبھی وہ بھی اپنی بیقراریاں بتا پاتا اُسے۔
کس خاموشی سے اُسے سزا دئے جا رہی تھی وہ؟

خاموش نگاہوں سے متبسم لبوں سے ۔

ڈنر سے واپسی پر تو صرف "ہاں" "نا" ۔ بلکہ نا ۔ نا کر ہی لیا تھا۔ مگر اب ۔ ایک مستقل چپ تھی ۔ اور وہ ۔ وہ پاؤں ٹھٹکتا آفس سے آئے آیا۔ کھانے کے بعد سو کر اٹھا۔ برآمدے میں نکلا۔ تو دیکھا

وہ نیلگوں آسمان پر نگاہ کیے کھڑی تھی ۔ یا تو باذوق ہونے بادلوں کی تھی ۔ یا پھر شاید اسی کا سبب آزماتے ۔

تھوڑی دیر ادھر ادھر دیکھتی رہی ۔ اور پھر اندر چلی گئی ۔ شاید اگلے پیپر کی تیاری کرنے ۔ وہ

جھنجھلایا۔ جھلایا سا اندر چلا آیا ۔

مگر اس کے باوجود ناراضگی کا اس کا یہ انداز اسے ایسا بھایا تھا۔ کہ اٹھتے بیٹھتے ۔ چلتے پھرتے بس اسی کی شاکی نظریں ۔ اور متبسم لب ۔ اس کی نگاہوں کے سامنے رہتے ۔

آج اس کا آخری پیپر تھا ۔ ماما سے اسے معلوم ہوا تھا ۔ اس کے تمام پیپرز بہت اچھے ہوئے تھے ۔ اور کل ہی وہ ماما کی ہمراہی میں صبح کی فلائیٹ سے اپنے آبائی گاؤں کے لیے روانہ ہونے والی تھی ۔ کیونکہ اس سے اگلے دن مسٹر نصیر احمد مکہ سے سیدھے اپنے آبائی گاؤں پہنچ رہے تھے ۔

اُس کے تاثرات کچھ ملے جلے جذبے سے ہو رہے تھے۔ وہ خوش بھی تھا۔ اور اُداس بھی تھا۔

وہ تین ماہ کے لئے جا رہی تھی۔ جبکہ وہ تین دن بھی اُسے دیکھے بغیر مشکل سے گزارتا تھا۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ وہ اُس سے ہے۔ باتیں کرے۔ مگر چپ رہی۔ اُس نے آگے سے بولنا ہی نہیں تھا۔

وہ بولتی۔ تو اب تک شاید اُسے کہیں باہر لے کر جاتا۔ یا کھلاتا۔ تنہائی میں ملتا۔ اپنے جذبوں کا اظہار کرتا۔ کچھ اُس کو بھی قریب سے پڑھتا۔ وہ جو اُس کے لئے اتنا بے قرار رہتا تھا۔ کیا وہ بھی اُنہی جذبوں سے گزر رہی؟

جہاں اُس کی شاکی نظروں اور متبسم لبوں سے اُس نے یہ اندازہ لگایا تھا۔ کہ وہ بھی اُس کے پیار کی قدر کرتی ہے۔ وہاں اُسے یہ بھی تو خدشہ تھا۔ کہ یہ محض اُس کی عادت ہی نہ ہو۔ اتنی نازک سی چیز۔ جھجکتی اور کچھ خفگی کا مظاہرہ کیوں کر گئی تھی؟

نظریں اُس کی چھپی حرکتوں پر شاکی رہتی تھیں اور لب متبسم رہتے تھے۔ تو لگتا تھا وہ بھی اُسے پسند کرتی ہے۔ مگر۔

وہ اُلجھن میں پڑ جاتا۔ پھر جھنجھلا جھنجھلا اُٹھتا۔ شام کو ٹیرس پر نکل آئی تھی۔ مگر وہ پاس نہیں گیا۔ کیا حق تھا پاس جانے سے؟

وہ برآمدے کے مرمریں ستون سے ٹیک لگائے بیٹھا اُداس ہو رہا تھا۔

شانی نے بھی ایک نظر اُس پر ڈالی تھی جو کچھ دنوں میں کملا رہی تھی۔ مگر وہ پاس نہیں گیا۔ یوں ہی اُداس چہرہ لئے اُسے تکتا رہا تھا۔

اب کم از کم اُسے دیکھتے رہنے پر تو پابندی نہیں رہی تھی۔ وہ اُسے چاہتا تھا۔ یہ شانی کو بھی معلوم تھا۔ اور اپنی پسندیدہ چیز کو لوگ دیکھتے ہی ہیں۔

صبح دس بجے وہ ایئرپورٹ جا پہنچا۔ ملک سرور بھی انہیں سی آف کرنے وہاں موجود تھے۔ اُسے وہاں دیکھ کر شانی کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔ لب مخصوص انداز میں متبسم ہو گئے تھے۔ وہ یقیناً اُس کی وہاں آمد پہ ناخوش نہیں ہوئی تھی۔

وہ ماما سے بھی ملا۔ اُن کے گاؤں کے متعلق پوچھتا رہا۔ باتیں کرتا رہا۔ پھر ملک سرور سے باتوں میں منہمک ہو گیا۔ مگر اس کے باوجود وہ محسوس کر رہا تھا۔ گرائش کی آواز ڈوبی ڈوبی سی ہے۔ اور وہ بمشکل اپنی ابا سی پہ قابو پائے ہوئے ہے۔

"آپ انہیں بولنا پڑے گا"۔ ملک سرور ماما کو کچھ ہدایات دینے مڑے۔ تو وہ بلا تمہید بول اٹھا۔

جانے کیوں؟ کئی دنوں بعد اُسے اپنے اتنے قریب دیکھ کر وہ بہت کچھ مرعوب سی نظر آنے لگی۔ پچھلے دنوں کی طرح بے نیازی نہ دکھا سکی۔ کچھ شاید اُس کے لہجے کا حکم بھی تھا۔ کہ

وہ جلدی جلدی پلکیں جھپکانے لگی۔ نہ اُن مخصوص شاکی نظروں سے اُسے دیکھنا۔ نا ہی لب متبسم ہو سکے۔

"خط لکھو گی؟" چند لمحے اُس کے جھکے سر کو دیکھنے کے بعد وہ پھر بولا۔

اور اُس نے گھبرا کر سر نفی میں ہلا دیا۔

"میں پکی ہوں؟" اس کا یخ بستہ ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر اُس نے مزید پوچھا۔

اُس نے پھر سر نفی میں ہلا دیا۔

"شاداں چلیں! آج بول دو۔ میں تمہیں لینے آؤں گا۔

آجاؤں؟" اس کے ہاتھ کو دھیرے سے تھپکا دیتے ہوئے اُس نے کہا۔

"نہیں"۔ بہت دنوں کے بعد آج وہ سر کے بجائے منہ سے بولی تھی۔

"کیوں نہیں؟"

"بس نہیں"۔ وہ کیا کہتی؛ ابا جان کیا سوچتے؟

اُسے معلوم تھا۔ اس کا ماحول زیادہ پابند نہ ہونے کے بعد بھی ایسا نہیں تھا۔ وہ خود بھی ان باتوں کی قائل نہیں تھی۔ لڑکے لڑکی کا ملنا جلنا، دوستی کرنا۔ پر اس کے گھر کا ماحول نہیں تھا۔ کیسے وہ اُسے دعوت دیتی آنے کی؟

اور پھر کوئی وجہ بھی ہو؟ وہ اس کا بھائی نہیں تھا۔ کزن نہیں تھا۔ خوامخواہ اُسے بلاتی؟

وہ اُسے چھیڑتا تھا۔ تنگ کرتا تھا۔ پھر اب شاید پسند کرنے لگا تھا۔ مگر اس طرح شاید وہ پہلے بھی پسند کی گئی ہو۔ آتنی تفصیل سے نہ سہی۔ دور دور ہی سے سہی۔

کتنے لڑکے اُس سے شادی کرنے کے خواہشمند تھے۔ یقیناً ان میں سے بھی وہ کسی کی پسند ہی ہو گی۔

اور بات تھی ۔ کہ اس کی پسند کا انداز نرالا تھا باقی سب سے ۔ مگر ۔
یہ سب اس کے سوچنے کی تو باتیں نہیں تھیں ۔
بابا جان مختارِ کل تھے ۔ اس معاملے میں ۔ اور وہ اندھا یقین رکھتی تھی ۔
اس بات پر ۔

وہ اُسے بُرا بھی نہیں سمجھتی تھی ۔ یقیناً بہت اچھا تھا وہ ۔ لیکن ۔
اوّل تو وہ شاید آجکل کے لڑکوں کی طرح صرف دوستی کا خواہش مند تھا ۔
اور پھر ۔
اگر واقعی وہ سیریس بھی تھا ۔ دوستی سے بڑھ کر بھی کوئی جذبہ تھا ۔ اُس کے
دل میں ۔ تو وہ ۔ وہ ۔

کوئی فیصلہ خود سے کرنے کی قادر نہ تھی ۔ یہ اختیار بابا جان کو تھا ۔
آجکل کے لڑکوں کی طرح " میں ملنے آجاؤں ؟ " اور لڑکی آگے سے کہہ
دے " ہاں " ۔ وہ ہرگز ایسی باتوں کی قائل نہ تھی ۔ راہ چلتے ایسے کئی لوگ مل جاتے
ہیں ۔ ہر ایک کو ENCOURAGE کرتے پھرنا اُسے اپنی تذلیل
معلوم ہوتی تھی ۔

وہ سولہ سال کی پوری ہو گئی تھی ۔ تو بابا جان اُسے پہلی بار کلب پارٹی میں
اپنے ساتھ لے جانے لگے تھے ۔ جب وہ تیار ہو کر باہر کار میں ان کے پہلو میں آ بیٹھی
تھی ۔ تو بابا جان کہنے لگے تھے ۔ " بیٹے ! لڑکی ایک شیشے کی مانند ہوتی ہے ۔ ذرا
SHOCK لگا ۔ اور ٹوٹ کر بکھر گیا ۔ تم اب سمجھدار ہو ۔ میں تمہیں پردے میں
نہیں بٹھاؤں گا ۔ کہ لڑکی بے دست و پا ہو کر رہ جاتی ہے ۔ میں تمہیں سر جانے

آزادی دوں گا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوگا۔ کہ تم بلا سوچے سمجھے کوئی
غلط قدم اٹھالو۔"

وہ قدرے رکے۔ کچھ سوچا۔ "تمہیں ہر بات کا اختیار ہے۔ تم اپنی مرضی
کی مالک ہو۔ مگر ایک بات یاد رکھو۔ ایک کام میری مرضی سے ہوگا۔ تمہاری
زندگی کا ساتھی منتخب کرنا میرا کام ہوگا۔ تم اس سلسلے میں کوئی کوشش نہ کرنا۔
اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا۔ کہ تمہاری شادی تمہاری مرضی کے خلاف کر دی جائے گی۔"

وہ دھیرے دھیرے سوچ سوچ کر بول رہے تھے۔ "ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔
تمہاری مرضی اس میں ضرور شامل ہوگی۔ مگر۔ وہ کون ہے؟ کیسا ہے؟ کیا کرتا
ہے؟ یہ معلومات مجھے ہوں گی۔ تمہارا کام صرف "ہاں" یا "نا" کرنا ہوگا۔ تم میرا
مطلب سمجھ رہی ہوگی۔ میں یہ قطعی نہیں چاہوں گا۔" باباجان، فلاں آدمی ہے۔
فلاں کاروبار کرتا ہے۔ یا باباجان! اس سے ملئے۔ یہ فلاں فلاں ہے۔" کبھی
نہیں۔ یہ کام میرا ہے۔ تم اس کے متعلق سوچنا بھی نہیں۔"

وہ متحیر سی بیٹھی باباجان کو بالکل نئے انداز میں دیکھ رہی تھی۔ یہ شاید
اس لیے تھا کہ اب وہ عمر کے اس دور میں داخل ہو گئی تھی۔ کہ جہاں باباجان
کے خدشات متوقع ہو سکتے تھے۔

اور تبھی شاید انہوں نے موقع پہ سمجھانا ضروری سمجھا تھا۔ بالکل ایک
مشفق دوست کی طرح انہیں زمانے کی اونچ نیچ سمجھائی تھی۔ وہ کم سن
تھی۔ بے ماں کے تھی۔ اور باباجان لمبا اوقات ملک سے باہر رہتے تھے۔ اور
پھر یہ باتیں اس کے ذہن میں یوں بس گئی تھیں۔

تو دانستہ ہی نہ کبھی بھولے سے بھی ایسا خیال ذہن میں نہیں لاتی تھی ۔
گھر سے باہر راستے میں، بازار میں، کچھ پارٹیز میں MIX GATHERINGS
میں ۔ اُس نے کبھی کسی لڑکے کی معنی خیز نظروں یا ذومعنی مسکراہٹوں کو کوئی اہمیت نہیں
دی کبھی کسی کو ENCOURAGE نہیں کیا ۔

جبکہ یہ عمر ہوتی ہی ایسی ہے ۔ فطری تقاضے ہی کچھ اس قسم کے ہوتے ہیں ہر
لڑکی اپنے کو اہم تصور کرتی ہے ۔ بقول چوک کی یہی تو عمر ہوتی ہے ۔ مگر نہیں ۔ اس نے
باباجان کی بات یوں گرہ میں باندھ لی تھی ۔ کہ ہر فضول چوک کے امکانی راستے بند کر دیئے تھے

جب زندگی کا ساتھی ہی انہوں نے چننا تھا تو پھر تردد کی ضرورت؟ ۔
اور پھر وہ کسی کو پسند بھی کر لیتی ۔ تو باباجان اُسکی شادی اس سے تو کرنے سے
رہے ۔ پھر خواہ مخواہ کا روگ پالنے سے مطلب ؟ ؟

مرد تو زندگی میں ایک ہی آتا ہے ۔ اور وہ باباجان کے ذمے تھا پھر
بھلا کسی کو پسند کر کے دل کو روگ لگانے سے کیا فائدہ تھا ؟ ؟ ؟

"اُس کی زندگی میں ایک ہی شخص آئے گا" آج اُس نے زندگی میں پہلی بار
سنجیدگی سے سوچا ۔ "اور وہ باباجان کی مرضی سے ہوگا ۔"

اس نے نظر اُٹھا کر اُسے دیکھا ۔

جانے کیوں؟ وہ بے طرح اُداس نظر آرہا تھا ۔

"میں تمہارے بغیر اُداس ہو جاؤں گا شائی بیگم" ۔ اُس کا ہاتھ ہولے سے
دباتے ہوئے خوبصورت پلکیں جھپک کر اُس نے دھیرے سے کہا ۔

اور وہ آہستہ سے ہاتھ چھڑاتی دھیرے سے مسکرا دی تھی ۔

جہاز کے ٹیک آف کا اعلان ہو گیا تھا۔ ملک سرور اور بابا بھی ان لوگوں کے
پاس آگئے تھے۔

وہ اسے جہاز کی آخری سیڑھی تک جاتے دیکھتا رہا تھا۔ پھر تھکے تھکے
قدموں سے واپس پلٹ آیا تھا۔

کار میں بیٹھ کر وہ واپسی کے لئے روانہ ہوا تو اسے معلوم ہوا۔ وہ اس کی
زندگی کی عزیز ترین متاع تھی۔

۲۴

اپنے آبائی گاؤں پہنچ کر اور بابا جان کو پا کر تو وہ جیسے ہر بات ہی بھول
گئی۔ صبح سویرے اٹھتی۔ نماز پڑھتی۔ بابا جان کے ساتھ ناشتہ کرتی۔ فارغ
ہو کر وہ اخبار دیکھتے۔ اور شائی اس دن کے لئے پروگرام مرتب کرتی۔ پھر
حسب پروگرام وہ بابا جان کے ساتھ چل پڑتی۔ کبھی تیتروں کا شکار کرنے
صبح سویرے نکل کر وہ شام کو ہی لوٹتے دونوں۔ کبھی گھر سے پیدل نکل کر وہ پیچھے
پیچھے اپنی حویلی کے ساتھ ساتھ بہتے تا حد نظر بہتے نالے کے کنارے کنارے دور
تک نکل جاتے۔ اپنے گاؤں کے ٹوٹے پھوٹے کچے مکانات کے آگے سے گزرتے۔
اپنے سیبوں اور باداموں کے باغات میں جا نکلتے۔ واپسی دوپہر کے کھانے پر ہی
ہوتی۔ دوپہر کو دونوں آرام کرتے۔ اور اس کے بعد اپنی وسیع و عریض قدیم طرز کی
حویلی کے اونچائی پہ بنے وسیع لان میں باپ بیٹی ڈھلتی دھوپ میں کرسیوں پر بیٹھ کر

اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے

بابا جان بالکل دوستوں کی طرح تھے جسب عادت اس بار بھی امریکہ سے کئی سلائیڈز ساتھ لے کر آئے تھے۔ درجنوں تصویریں۔ جو آئے رات کو بیٹھ کر پردہ سکرین پر دکھاتے رہتے۔ اس کے لئے بیش قیمت تحائف لائے تھے۔ اور بہت ساری وہاں کی نئی نئی باتیں اور خبریں بھی۔

وہ پہروں اکٹھے رہتے۔ اس کے امتحان سے لے کر سیاست تک پر بحث ہوتی رہتی۔ اور

یوں دن ہنسی خوشی خوشی گزر رہے تھے۔ وہ بابا جان کی سنگت میں خوش تھی۔ بہت زیادہ۔ مگر

دن کی مصروفیت سے فراغت کے بعد۔ رات کی تنہائی میں۔

جانے کیوں؟

وہ چونک اٹھتی۔ اس کی نظروں میں ایک شبیہہ سی اُبھرتی۔

لمبا قد۔ چوڑے شانے۔ متاثر کن پرسنیلٹی۔ مسحور کن باتیں۔ ہردم بولتی پُرکشش آنکھیں۔ اور اس کا دل یکبارگی دھڑک اُٹھتا۔

ایسا تو اس سے قبل کبھی نہیں ہوا تھا۔

اتنی زیادہ دیر تک تو کبھی کسی کی صورت اس کے ذہن میں نقش رہی تھی۔ وہ گھبرا کر اس تصور سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرتی۔

نیند کی سعی۔ مگر۔ بے سود۔

پھر وہ پاس رکھا کوئی میگزین اُٹھا کر دیکھنے لگتی۔ اور یوں دھیرے دھیرے

نیند کی آغوش میں جا اُترتی -

اور -

اب تو وہ دن کو بھی کھوئی کھوئی سی رہنے لگی تھی - باباجان سے باتیں
کرتے کرتے چونک اُٹھتی . باباجان کی موجودگی میں بے انتہا خوش ہوتے
ہوئے بھی اُسے لگتا . اُسے کچھ کمی ہے - کس چیز کی ؟ یہ کیسی کیفیت تھی ؟ ؟ -
وہ خود بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی .

اور پھر تو -

جوں جوں دن گزرنے لگے - اُٹھتے بیٹھتے - چلتے پھرتے — وہی صورت
نظروں کے سامنے رہنے لگی کبھی اُدٹ پٹانگ حرکتیں کرتا ہوا - کبھی ہاتھ جوڑے
معافی مانگتا ہوا . کیا تھا یہ سب ؟ —

پھر -

آہستہ آہستہ اُسے عجیب سی خواہش ہونے لگی - وہ تنہا ہو - اور اُسی کے
متعلق سوچتی جائے . کوئی مخل نہ ہو . اور تبھی وہ گھبرا کر یوں لیٹی بستر سے اُٹھ کھڑی ہوتی
گرم گرم کمرہ چھوڑ کر باہر نکل جاتی - لمبی لمبی راہداریوں میں بلا مقصد ٹہلنے لگتی .

کہیں -

وہ نادانستگی میں . لاشعوری طور پر . اُسے پسند تو نہیں کرنے لگ گئی تھی ؟ . —
سوچ کر ہی وہ دم بخود رہ جاتی . —— اور باباجان کی پسند ؟ — اُن کی چند سال پہلے
کی گئی نصیحت ؟ —— وہ اُلجھ اُلجھ جاتی ——

دن آہستہ آہستہ گزر رہے تھے . وہ سارا دن اپنے کو مصروف رکھتی —

بابا جان کے ساتھ ماما کے ساتھ۔ اکیلے میں تو اُسے وحشت سی ہونے لگی تھی۔

ہوائیں بہت تیز چل رہی تھیں۔ لال لال ٹیلے خاموش خاموش سے تھے۔

سبزہ آب و گیاہ میدان اور ننگے پہاڑ چپ چاپ سے تھے۔

ماما اُس کے لئے رات کو پہننے کے لئے نرم سا سفید لمبا آستین کا سوئٹر بنتے ہوئے گزرے دنوں کا ذکر کر رہی تھیں، کچھ اُس کے امتحانوں سے متعلق، کچھ دبلا کی کوٹھی کے دیکھ بھال سے متعلق — کچھ ان دنوں اُدھر کی بے تحاشا سردی سے متعلق — اور

ہیں وہ — اس کا بھی ذکر کرتیں۔

وہ بڑی طرح چونکی — وہ چاہتی تھی۔ ماما اسی کی باتیں کرتی جائیں۔ کیوں؟

— اُسے تو جیسے وہم سا ہو گیا تھا۔ اپنے آپ سے خوفزدہ سی رہنے لگی تھی۔

تین ماہ اُن کے پڑوس میں رہا تھا۔ اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتا تھا۔ پھر اُس کی پسند کا بھی دعویٰ کرنے لگا تھا۔ تقریباً ہر روز ہی اُس کی صورت نظر آتی تھی — اور یہی وجہ تھی شاید۔ کہ وہ چاہتے ہوئے بھی اُس کا خیال ذہن سے نکال نہیں پا رہی تھی،

کچھ دن اور اسی اُلجھن میں گزر گئے۔

وہ بابا جان اور اُن کے چند ادھیڑ عمر دوستوں کے ہمراہ شکار پر گئی تھی۔ دن بہت اچھا مصروف سا گزر گیا تھا۔ وہ اپنے کو واقعی ہلکا محسوس کر رہی تھی۔

شام ہو رہی تھی۔ سورج کی کرنیں سرخی پہاڑ سے آخری بار جھانک کر چھپ چکی تھیں۔ اُفق میں سرخی مائل سیاہ رنگ گھل رہے تھے۔ دن تمام ہو چکا تھا۔ روشنیاں سیاہیوں میں بدل رہی تھیں۔ ماحول سوگوار سا ہو رہا تھا۔

یہ سب ڈھک گئے تھے۔ وہیں اونچی نیچی پتھریلی زمین پر خشک جھاڑیوں کے
آس پاس بیٹھے گروہ لوگ چائے پیتے ہوئے واپسی کی تیاری میں تھے۔
وہ بھی پیالی ہونٹوں سے لگائے چپ چاپ بیٹھی سامنے تاریکیوں میں ڈوبتے
سیاہ پہاڑ کو تک رہی تھی۔
اچانک گھنگھور اندھیرے میں سیاہ سوٹ میں ملبوس لمبا تڑنگا انسانی ہیولہ پہاڑ
کے دامن کے ساتھ ساتھ چلتا آگے نظر آیا۔ اور اس کا دل بے ترتیب ہو کر دھڑکنے
لگا۔
وہ تو نہیں تھا۔ مگر قد کاٹھ۔ سیاہ سوٹ کچھ ملتے جلتے سے تھے۔
آسے اپنی گہری مایوسی کا احساس ہوا۔
اور
اب ماں باپ تو دور اداسی رہنے لگی تھی۔ چپ چاپ سی۔ افسردہ افسردہ
سی۔ ان تین برسوں میں ایک بار بھی اس کے خیال کو ذہن سے جھٹک نہیں سکی تھی۔
تین ماہ پورے گزر چکے تھے۔ پچھلے الیکشن کی وجہ سے جہاں امتحان لیٹ ہوئے
تھے۔ وہاں رزلٹ بھی اتنا جلد نہیں آ سکا تھا جتنا غیر معینہ مدت کے لئے لیٹ تھا۔
آسے اکثر خواہش ہوتی۔ رزلٹ آ جاتا۔ تو وہ ایم اے کرنے کے لئے واپس
وہاں جاتی۔ وہی ماحول۔ وہی سب کچھ پھر ہوتا۔
آسے یہ سن کر بڑی حیرت سی ہوتی۔ بابا جان ایک ماہ بعد پھر امریکہ جا رہے تھے۔
یہ ماہ کے بعد وہ ان کی آمد اس کے لئے دو گنی خوشیاں لاتی۔ نا جانے ان
کی دوبارہ روانگی کے خیال سے اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ ایک عجیب سی بے چینی ان کے

درمیان آگئی تھی۔ تیسرا جذبہ۔ تیسری دلچسپی۔ تیسری کشش۔ جو اُسے بابا جان۔
ماما۔ گھریلو دلچسپیوں اور آس پاس کی ذمہ داریوں کی طرف۔
ڈھیل دے دے کر بھی واپس اپنی طرف کھینچے جا رہی تھی۔
ایک اور بھی کیفیت بڑی عجیب تھی۔
اُسے اپنے میں اس کا انتظار رہتا تھا۔ اُس کی آمد کا۔ اس کے خط کا
یا۔ اُس کے ٹیلیفون کا۔ اور
پھر یہ سب نہ ہوا۔ تو وہ اپنے آپ سے ہی اُکتا پڑی۔ کیسے بلند بانگ دعوے
پیار کے کرنے لگا تھا "میں تمہارے بغیر اداس ہو جاؤں گا"۔ اور پھر بالکل عین [illegible]
کے لڑکوں کی طرح پلٹ کر بھی نہ پوچھا۔ وہ مشتعل سی ہو گئی۔
اور
پھر بابا جان کی روانگی میں صرف تین دن رہتے تھے۔ ماما نے اُسے بتایا۔
بابا جان کے ایک دوست نے اپنے بیٹے کے لیے اس کا رشتہ طلب کیا ہے۔
خاندان بہت اعلیٰ۔ لڑکا بہت اچھا ہے۔ اونچے عہدے پر فائز ہے۔
صاحب کہتے ہیں۔ "خاندان دیکھا بھالا ہے۔ لڑکا شریف اور لائق ہے
مجھے پسند ہے۔ شادی کی مرضی پوچھ لیں آپ۔" مگر ایک بات یاد رکھو۔ ایک
میری مرضی سے ہوگا۔ تمہاری زندگی کا ساتھی منتخب کرنا میرا کام ہوگا۔"
اور اُسے اپنی گزشتہ سوچیں۔ پریشانیاں۔۔ اچانک ہی خس و خاشاک کی
کی طرح بہتی نظر آئیں۔
سہیلیوں لڑکوں کے لیے اس کا رشتہ مانگا گیا تھا۔ مگر آج تک کوئی بھی

باباجان کے معیار پر پورا اترا تھا۔ یا تو وہ باباجان کو بے حد عزیز تھی۔ اور وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے۔ یا پھر باباجان کا سٹینڈرڈ بہت اونچا تھا۔ اور آج تک اس پر کوئی فٹ نہیں آسکا تھا۔

بہرحال۔ یقیناً یہ جگہ ہر لحاظ سے موزوں ترین تھی۔

باباجان تو یوں بھی مختارِ کل تھے۔ اس معاملے میں۔ آج شاید وقت آن پہنچا تھا۔ ان کے فیصلے کا۔ وہ انکار کی قادر نہ تھی۔ پھر کہیں نہ کہیں۔ کبھی نہ کبھی اس کی شادی تو ہونی ہی تھی۔ جب لڑکا شریف اور لائق تھا۔ خاندان دیکھا بھالا اور اچھا تھا۔ تو وہ انکار کس بل پر کرتی؟

باباجان یوں بھی اس کے مستقبل کے متعلق فکر مند رہتے۔

"چل چلاؤ کے دن ہیں ماما۔ شانی اپنے گھر بار کی ہو جائے۔ میری زندگی میں۔ تو سکون سے مر سکوں گا۔" اور بھی کئی نصیحتوں اور زمانے کی اونچ نیچ بتانے کے بعد ماما نے زندگی میں پہلی آواز میں آپ سے باباجان کی یہ بات بھی بتا دی۔

"بیٹی۔ صاحب کی ذمہ داریوں کا خیال کرو۔ تمہاری فکر سے آدھے ادھر۔ آدھے ادھر۔ کاروبار کی دیکھ بھال بھی بڑی مشکل سے کر رہے ہیں۔ بیگم صاحب کو خدا جنت نصیب کرے۔ آج زندہ ہوتیں۔ تو کاہے کو صاحب یوں پریشان ہوتے۔ پھر بیٹی! جوان لڑکی کو کب تک گھر بٹھایا جا سکتا ہے۔ اصلی گھر تو اس کے شوہر کا گھر ہوتا ہے۔ لڑکا اچھا خاندان اچھا ہے۔ بڑی بڑی شاہزادیوں کی قسمت کا پتہ نہیں چلتا۔ اور پھر بیٹی! شادی بیاہ کی بھی ایک خاص عمر ہوتی ہے۔ موئی تیس سال کی لڑکی کے بیاہ پر تو مجھے بھی ہنسی آتی ہے۔" شال کے پلو سے آنکھیں پونچھتے ہوئے ماما رشتے

روتے ہنس پڑیں ۔

"باپ کے گھر میں بھی بیٹی جوان ہو جائے تو بوجھ بن جاتی ہے" ۔ دُکھ سے سوچتے ہوئے وہ بھی ماما کی آخری بات پر مسکرا دی ۔

اُس کے پیارے باباجان ، مشفق ، ہمدرد دوست ۔ ممی کی وفات کے بعد دل پر کتنا بڑا بوجھ لئے تنہا جی رہے ہیں ۔

"جیسے باباجان چاہتے ہیں ماما ۔ ویسا ہی ہوگا" اُس کی خوبصورت آنکھیں نم ہو گئیں ۔

اُس کی معصوم روح پر بھی تو بوجھ تھے ۔ کچھ باباجان کی کہی دُکھ بھری باتوں کا بوجھ تھا کچھ اُس کی اپنی ذات سے وابستہ باتوں کا بوجھ تھا ۔

بہرحال باباجان کی روانگی سے ایک دن قبل لڑکے کی والدہ اور خالہ آئیں ۔ اُسے چمکتے ہیرے کی انگوٹھی پہنائی ۔ اور اُسی شام کی فلائیٹ سے واپس چلی گئیں ۔

یوں باباجان کے ذہن پر کا گراں بار ہلکا ہو گیا ۔ اور خود ۔ اُس کی اُلجھن ۔ بے چینی اور اشتعال بھی مدھم پڑ گئے ۔ اپنی دانست میں ایک اور بدلہ اُس سے لے سکی تھی ۔ شاید اسی لئے ۔

باباجان امریکہ سدھار گئے تھے ۔ معمول کے مطابق پھر ماما کے ساتھ تنہا رہ گئی تھی ۔

چند دن تو اس کا ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا رہا۔ لڑکے کی والدہ اور خالہ کا آنا۔ اُسے انگوٹھی پہنانا۔ پھر اُسے اُس لڑکے کا بھی خیال آتا۔

کبھی وہ اُن لوگوں کے متعلق سوچتی۔ کبھی بابا جان کے متعلق۔

چند دن نئے ماتھے اور نئے لوگوں کے خیالوں کی نذر ہو گئے۔ مگر۔ اس کے بعد پھر۔ وہی سکوت چھا گیا۔ وہی ہوا سے سر اٹھانے لگے۔ وہی شبیہ آنکھوں کے سامنے اُبھرنے لگی۔ وہ اُلجھ اُلجھ گئی۔ اُسے اجنبی ہونا چاہیئے تھا۔ اب وہ کسی اور کی امانت تھی۔ اس سے ہٹ کر کسی اور شخص کے متعلق سوچنا اُسے گناہ لگنے لگا۔ مگر۔ پھر بھی۔ اُٹھتے بیٹھتے۔ چلتے پھرتے۔ وہی وہ نظر آنے لگا۔ کبھی کبھی تو وہ سوچتی۔ وہ ضرور پاگل ہو جائے گی۔ ایک طرف بابا جان کی خواہش۔ بلکہ اس خواہش میں اس کی مرضی بھی شامل کی گئی تھی۔

دوسری طرف دل کے داغ تقاضے تھے۔

وہ پھر سے اُداس اُداس۔ بلکہ چڑچڑی۔ چڑچڑی سی رہنے لگی۔ کل تو وہ ماما کی چھوٹی سی بات پر رو دی تھی۔

"بیٹی۔ صاحب کہہ گئے تھے۔ جمیل صاحب سے کہنا۔ تم ضرور بڑے لینی رہنا۔ زیور بھاری اور اعلیٰ معیار کا ہونا چاہیئے۔ باقی سب چیزیں بھی تمہاری ہی پسند سے بنوانے کا کہہ گئے ہیں۔"

وہ سن کر خاموش ہو گئی تھی۔

"اور ہاں بیٹی! دیکھو تو۔ صاحب کہہ گئے تھے۔ بندوق ریوالور وغیرہ کریم سے کھلوا کر صاف کروا کے تیل لگوا دینا۔" وہ بڑے سے سلیف کی طرف

بڑھتے ہوئے بولیں "اور مجھے دیکھو صاحب کو گئے پندرہ بیس دن ہو گئے آج یاد آیا"
وہ اب بھی کرسی پہ نیم دراز خاموشی سے انہیں تکتی رہی۔

"اسے بیٹی"۔ وہ ایک پستول نکالتے نکالتے گویا ہوئیں "یاد ہے نا فوزی تک صاحب کا بیٹا۔ ہمارے کتنے قریب گولی چلائی تھی۔ اپنا تو دل اب بھی دھک دھک کرنے لگتا ہے۔ سوزی کر۔ یاد ہے نا بیٹی؟" وہ رخ اس کی طرف کرتے ہوئے مسکرائیں۔

"جی"۔

"تم کچھ چپ چپ سی ہو۔ صاحب کے بنے اداس ہو گی؟" وہ پستول ہاتھ میں لیے قریب چلی آئیں۔

پھر اس کا سر شفقت سے اپنے پہلو سے لگا لیا۔ "دل تھوڑا نہ کرو بیٹی۔ اب تو ان کی واپسی میں بھی دن تھوڑے رہ گئے ہیں" پھر ہاتھ میں پکڑے پستول کو تکنے لگیں۔

"اور پھر ہمارے قریب آ کر بھی وہ شہزادہ صاحب گولی چلائے جا رہا تھا۔ کیسا شریر تھا۔ یاد ہے نا؟"

"ہاں ماما یاد ہے"۔ وہ کچھ جھنجھلائی سی بولی۔

"مجھے بہت اچھا نہیں لگتا تھا ماما"۔

"ہوں ماما"۔ جانے کیوں؟ اس کے لہجے میں بے بسی سمٹ آئی

"لیکن تھا بہت نیک لڑکا"۔ ماما اس کے دلی جذبات سے بے خبر لباس اسلحہ سیف سے نکالتے نکالتے بولتی گئیں۔

"ہوگا"۔ اس نے دھیرے سے کہا۔ اور

ساتھ ہی وہ آنکھوں کی نمی چھپانے کو پلکیں جھپکانے لگی۔

اُس نے چونک کر انگلیاں گالوں پر پھیریں ۔ آنسو تو اب بھی اُس کی آنکھوں سے رواں تھے ۔

ایک گہری سانس لے کر وہ کرسی پر سے اُٹھ آئی ۔ انگلیوں کی پوروں سے آنکھیں رگڑتے ہوئے وہ کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی ۔

اونچے اونچے فصیل نما سرمئی پہاڑ اب بھی پورے شہر کو گھیرے میں لئے ہوئے تھے ۔ اونچے نیچے لال لال خشک ٹیلے اس وقت بھی چپ چاپ سے تھے ۔ اونچی نیچی ناہموار پتھریلی زمین پر جا بجا آگی خشک جھاڑیاں البتہ زمیں بوس ہو ہو کر تیز چلتی ہواؤں کا پتہ دے رہی تھیں ۔ سنہری دھوپ ۔ اور تیز ہوا کا عجیب سا امتزاج ہوتا تھا ۔ ہواؤں کے جھکڑوں کے آگے سنہری چمکتی دھوپ کی کبھی ایک نہ چلی تھی ۔ سردی کی شدت کا اندازہ کرتے ہوئے اُسے جھرجھری سی آگئی ۔

" تمہارا خط ہے شانی بیٹے " ۔ ماما ہاتھ میں نیلے رنگ کا لفافہ لئے اندر داخل ہوئیں ۔

" میرا خط ؟ " لفافہ ہاتھ میں لیکر الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے وہ کچھ حیرانگی سے بولی ۔

بے حد خوبصورت ۔ اجنبی ہینڈ رائٹنگ میں انگلش میں لکھا اس کا ایڈریس لفافے پر درج تھا ۔

اُسی حیرانگی سے اُس نے لفافہ چاک کیا ۔ تہہ شدہ نیلے رنگ کا کاغذ کھولا ۔

" میں نے تمہیں دیکھا ۔ تم اچھی لگیں ۔ امی سے ذکر کیا ۔ وہ فوراً مان گئیں ۔

ہمیشہ ڈیڈ تمہارے فادر نے آزمائش میں ڈالے رکھا۔ اور آخر کار غم میری ماما کو لے گئیں۔
میرا دل چاہتا ہے کہ تم سے ملوں۔ تمہیں دیکھوں قریب سے۔ ملو گی نا؟ .....“
اور جانے کیا کیا لکھا تھا۔

اس نے یقیناً اسے دیکھا ہوگا۔ کہیں بھی۔ کالج جاتے ہوئے۔ کسی فنکشن میں۔
اس کی والدہ بھی یہی کہہ رہی تھیں۔ ”وہ کہتا ہے مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔“
”مجھے خط کا جواب ضرور دینا۔ لکھو گی نا خط؟ میں تمہیں اپنے PARENTS کے
بارے میں کچھ بتا رہا ہوں۔ تم اسی پر خط لکھنا۔ میری پوسٹنگ نئی نئی ہوئی ہے۔ ہاسپٹل کا پتہ!
خط جلدی ملنے۔ تمہارا خط میرے لئے بہت قیمتی ہے۔ اور میں ہرگز نہیں چاہوں گا کہ وہ
کھو جائے۔ یا کسی اور کے ہاتھ لگ جائے..... تمہارا اپنا.....“

ایک گہری سانس لے کر وہ آہستہ قدم چلتی اپنے بیڈ تک آئی۔ بے مقصد
سی بستر پہ دراز ہوتے ہوئے اس نے خط اور لفافہ اپنے بیڈ سائیڈ ٹیبل پہ
رکھ لئے۔

”پیار سے پسند کرتا تھا۔ اور وہ کسی اور کو۔ کیسا سکون تھا کسی بھی نقطے
پہ دو دلوں کا ملنا نہیں ہو پا رہا تھا۔“

وہ دکھ سے سوچتی رہی۔

اس کا خط پا کر اسے کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ ایک اجنبی مرد نے اسے
مخاطب کیا تھا۔ چند لمحوں کے لئے اس کے سانسوں کی رفتار ضرور تیز ہو گئی تھی۔
مگر ــــ اور کچھ بھی نہ ہوا تھا۔

کبھی وہ سوچتی اس منگنی سے انکار کر دے۔ لیکن کہیں نہ کہیں جھجک سی

تو اس کی شادی ہونی ہی تھی۔ کہ لقبول کیسے لڑکی لاکھ اپنے کو خود SUPPORT
کرے پھر لڑکی ہوتی ہے۔ بغیر مرد کے سہارے کے لڑکی کچھ نہیں ہوتی۔ تو پھر یہ
مردیا۔ کوئی اور۔ سبھی برابر تو تھے۔ اس سے انکار کس امید پہ؟
کیا یہاں انکار کردینے سے اُسے اپنی پسند مل جاتی؟
اپنی پسند۔
جو پسل کرکے یوں منہ موڑ گیا۔ جیسے کبھی پہچان ہی نہ ہوئی ہو اُس سے۔
پھر وہ یہ بھی شکر کرتی۔ اُس نے اُس کی محبت پہ یقین کرکے اچھا تھا اُسے
ENCOURAGE نہیں کیا تھا۔
اور کبھی وہ سوچتی۔ تب اُس کی FEELINGS ایسی تھیں بھی کب؟ -
تب تو وہ یوں ہی بس اس کی چھیڑ چھاڑ کا رد عمل سمجھ رہی تھی۔
شروع میں اُسے محض ایک لوفر اور۔ بعد میں ایک معصوم اور بے ضرر
شخص۔ مگر۔
ساتھ ہی وہ مانتی تھی۔ وہ اُس کی بے پناہ پرکشش شخصیت۔ اور میٹھی
باتوں سے متاثر بھی ہوتی تھی۔ مگر۔ اس کو پیار کا نام تو نہیں دیا جا سکتا تھا۔
وہ اُس سے ناراض بھی ہوتی تھی۔ پھر مسلسل ناراض رہی تھی۔ یہ بھی ضروری نہیں تھا
کہ دل میں محبت کا جذبہ موجزن تھا۔ تبھی ایسا تھا۔

کبھی وہ سنجیدگی سے سوچتی۔ وہاں گزارے دنوں کا تجزیہ کرتی۔ تو چونک
اُٹھتی۔ اُس سے متعلق ایک ایک بات کو سوچا تو اب اُس کی عادت سی ہو

گئی تھی ۔ اور تبھی
ایک ایک بات ۔ ایک ایک واقعہ یاد آتا ۔ تو اُسے قائل ہونا پڑتا ۔ کہ ذہن اگرچہ انکاری تھا ۔ پر دل ضرور اُس کے حق میں تھا ۔ پھر
وہ کھانا کی تن تن پر چونکی جب عادت اس وقت بھی وہ گھنٹہ بھر سے اسی کے متعلق سوچے جا رہی تھی ۔ اُس نے پھر سر جھٹکا اور ہاتھ بڑھا کر سائیڈ ٹیبل پر رکھا خط اُٹھا لیا ۔

اسی طرح ہی شاید وہ اُس کی یادوں سے چھٹکارا حاصل کر سکتی تھی ۔
" مجھے خط کا جواب ضرور دینا ۔ لکھو گی نا خط ؟" سرسری نظریں خط پر دوڑاتے ہوئے وہ یہاں تک پہنچی ۔ تو

چونک اُٹھی ۔ کیوں نہ وہ اسے خط کا جواب لکھ دے ؟ جواب دینا اس کا اخلاقی فرض بھی تھا ۔ اور اسی طرح خط و کتابت کا سلسلہ چل نکلتا تو شاید ۔ شاید اس کا دھیان بٹ جاتا ۔ اور شاید ۔ وہ اُسے بھول جانے میں کامیاب ہو جاتی ۔

اس نئی سوچ سے اُسے کچھ تقویت ملی ۔ اور خط ہاتھ میں لے کر وہ کونے میں رکھی ڈریسنگ ٹیبل کے آگے جا بیٹھی ۔ پھر اُس نے اُسے خط کا جواب لکھ دیا ۔ سادہ سا ۔ چند سطروں پر مشتمل ۔ جہاں بھی اُس نے دیکھا ۔ قلم چل رہا تھا ۔ مگر الفاظ میں کوئی بھی جذبہ بھرنے سے قاصر تھا ۔

لفافے میں بند کر کے اُس نے اُس کا ایڈریس لکھا ۔ اور ٹکٹ لگا کر اُٹھ کھڑی ہوئی ۔ سیڑھیاں اُتر کر وہ نیچے گئی ۔ بیرے کو خط پوسٹ کرنے کو دیا ۔ اور خود خالی خالی ذہن لئے اپنے وسیع لان میں نکل آئی ۔

پرندوں کے غول کے غول انس کے سر کے اوپر سے گزرنے اپنے آشیانوں کی طرف بڑھنے لگے تو اسے ہوش آیا۔ شام کے سائے پھیلنے شروع ہو گئے تھے۔ اور وہ انس کی باہوں سے چھٹکارا پانے کی نئی ترکیب پر عمل پیرا ہونے کے باوجود یہ تمام وقت انس کے متعلق سوچتی رہی تھی۔ وہ بے بس سی سامنے دیکھنے لگی۔ وسیع نالے کا پانی چمکتی ریت میں لکیریں سی بناتا اپنی مخصوص سمت میں رواں دواں تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی۔ وہ واقعی بے بس ہوتی جا رہی تھی۔ نم آنکھیں جھپکتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ اندر کی طرف بڑھی۔

اور پھر خط و کتابت کا سلسلہ چل ہی نکلا۔ وہ تو انس کا جواب پا کر جیسے دنیا جہان کے تمام خزانے پا گیا تھا۔ انس کے خط میں کتنی بیقراریاں تڑپ رہی تھیں۔ "تمہارے بابا جان نے چھ ماہ کی مہلت دی ہے۔ آپ کو کیا معلوم میں چھ سکینڈ بھی مشکل سے گزار رہا ہوں۔ تم نے یہ نہیں لکھا میں تمہیں ملنے آؤں یا نہیں؟" وہ بھی انس کے خط کا جواب دے دیتی تھی۔ مگر الفاظ میں رنگینیاں نہ بکھیر سکی۔ کہ ایسا جذبہ ہی دل میں مفقود تھا۔ انس نے کبھی اس کا خط سامنے رکھ کر جواب نہیں دیا۔ بس ایک ڈیوٹی ایک اخلاقی فرض۔ بلکہ سب سے بڑھ کر اس امید پر کہ وہ اپنے دل و دماغ میں امڈتے طوفان پر قابو پا سکے گی۔۔۔ وہ اس کے خط کا جواب دیتی۔۔۔ بالکل

سیدھا سادا سا جذبی لائینوں پر مشتمل۔ وہ گلہ بھی کرتا۔ کہ اس کا خط بہت مختصر ہوتا ہے۔ کیوں وہ اس کا خط سامنے رکھ کر اسے جواب نہیں دیتی؟ اس کے اکثر سوالوں کا جواب مبہم کر جاتی ہے۔ بلکہ وہ تو اب ہر خط میں یہ بھی پوچھنے لگا تھا کہ کیا وہ بھی اس کے لیے اتنی ہی بے قرار نہیں جتنا وہ بے قرار رہتا ہے۔۔؟

چاہنے کے باوجود بھی وہ اپنے الفاظ میں شدت اور ترتیب نہ بھر سکی۔ کہ یہ سارے جذبے تو اب صرف کسی کی یادوں کے لیے وقف ہو گئے تھے۔

اسے تو یاد بھی نہ رہتا کہ اس نے خط میں لکھا کیا ہے۔۔؟ اور وہ جواب کیا دے رہی ہے؟

کوشش کے باوجود وہ اپنی سکیم میں کامیاب نہ ہو سکی۔ کہ سانس بن بن کر کسی اور کا نام آ رہا تھا۔

ماحول سہما سہما سا تھا۔ ہوا رکی رکی سی۔ دور تک پھیلا پہاڑی نالہ بھی دھیمی رفتار سے رواں تھا۔ جگنوؤں کا لشکر بھی جیسے اداس اداس تھا۔

حویلی کے پاس ہی رکی رکی سی رفتار سے بہتے پانی پر نظریں جمائے وہ سرمئی چٹان سے لگی کھڑی تھی۔

آج تو جیسے یادوں نے حملہ بول رکھا تھا۔

"اتنی سی ہو جو خود کسی میں سب سے دبلی گڑیا لگتی۔ مگر تم نے پھر بھی اتنے بڑے آدمی کو مار گرایا ہے۔" اپنے نازک سے ہاتھوں پر نظر ٹیکنے کی جانے کیوں؟ اسے تیمم سی یاد آیا۔ ڈنر سے واپسی پر اسے گھر سے جاتے ہوئے راستے میں وہ بولا گیا تھا۔

اس نے دیکھا۔ اس کے دائیں ہاتھ کی انگلی میں منگنی کی خوبصورت انگوٹھی

جھلک رہی تھی۔ وہ اُسے ہر وقت پہنے رکھتی تھی کہ ہو سکتا ہے یہی انگوٹھی اس کا دھیان
بار بار اُس کی یادوں سے جُھٹکا دلانے میں مددد معاون ثابت ہو۔ اور
شاید انگوٹھی دینے والے کے لئے دل میں پسندیدگی کے جذبات ابھر سکیں۔ مگر۔ اسے لگا۔
یہ سب ناممکن ہے۔ واقعی پیار ایک ہی بار کیا جاتا ہے۔ بلکہ ہو جاتا ہے
مگر کیا۔
اُس پر بھی یہی بات صادق نہیں آتی؟ اُس نے اچانک سوچا۔ اور پھر
وہ مزید نہ کھو سکی۔ خیالات سے سر جھٹک کر اُس نے سنبھالا لینا چاہا۔ مگر
آج دل بُری طرح بے قابو ہو رہا تھا۔
"ڈیشنگ پرسنیلٹی والے ڈی سی کا کیا حال ہے؟ وہ تو بڑا بے قرار لگتا تھا۔
خط وغیرہ تو لکھتا ہوگا۔ تمہارے بغیر جانے کیسے وقت گزار رہا ہوگا بچارا؟ کہیں تُم
بہن کو بھیج کر پتہ ہیں سے اُڑنے کی کوشش تو نہیں کر رہی؟ ضرور کچھ کیا ہوگا۔ تم بتاتی
نہیں ہو۔ پچھلے خط میں بھی بات گول کر گئیں۔ بلکہ وہ تو بڑا تیز تھا۔ خود ہی تو نہیں پہنچ
گیا کہیں؟......"
آج ہی صوفیہ کا خط اُسے ملا تھا۔ تمام خط اُسی کی باتوں سے بھرا پڑا تھا۔
وہ سنبھل نہ سکی۔ دل بھر بھر آیا۔ اور پھر۔ پھر۔ بازو کے حلقے میں
چہرہ چھپائے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔
آج پھر وہ پرندوں کی پرواز کی مخصوص سرسراہٹ سے چونک اُٹھی۔ سر اُٹھا کر
اوپر دیکھا۔ انگلیوں کی پوروں سے جتنے آنسو صاف کئے۔ اور دکھی سانس لیکر

پرندوں کے تعاقب میں دیکھنے لگی۔

تبھی دائیں طرف قدرے فاصلے پر اونچی پہاڑی پر واقع طلسماتی محلوں کے شان والے پولیٹیکل ایجنٹ کے ریذیڈنس پر نظر پڑی۔

دنوں بعد پورے کا پورا بنگلہ آج روشنیوں سے جگمگا اٹھا تھا۔

ان کی حویلی سے کوئی آدھے فرلانگ پر پی۔اے کے ریذیڈنس کا گیٹ تھا۔ گیٹ سڑک کے کنارے پر تھا۔ اور پھر اسی گیٹ سے سڑک کئی گولائیاں گھومتی ہوئی اوپر جاکر طلسماتی ریذیڈنس پہ ختم ہوتی تھی۔

وہ چھوٹی سی تھی۔ تو بابا جان کے ساتھ ایکبار وہاں منعقد ڈنر میں گئی تھی۔ جب اسے لگا تھا کہ وہ کسی طلسماتی محل میں آگئی ہے۔

وہیں پہاڑی پر اوپر لان بھی بنے تھے۔ خوبصورت سن روم تھے۔ وسیع و عریض کمرے تھے۔ بالکنیاں تھیں۔ بارہ دریاں چبوترے تھے۔ مہمان خانے تھے۔ وہیں اوپر پی اے کا دفتر بھی تھا۔ اور

یہیں گولائیاں گھومتی سڑک واپس نیچے اترتی تھی۔ تو گیٹ عام شاہراہ پر کھلتا تھا۔

نیچے گیٹ سے لے کر اوپر ریذیڈنس تک گول گول گھومتی سڑک پر کھمبوں پر لگی بتیاں جل رہی تھیں۔ اور ریذیڈنس میں جلتی روشنیاں اندھیرے میں جگمگ جگمگ کرتے ستاروں سے مشابہ تھیں۔

پچھلا پی اے تبدیل ہو کر چلا گیا تھا۔ ریذیڈنس ویران سا نظر آنے لگا تھا آج صبح ہی نئے پی اے نے چارج لیا تھا۔ اسے اپنے ڈرائیور نے بتایا تھا۔

تھی انجانے پیرانہ تیرے میں جگنو چمکنے لگے تھے -
اُن کی اپنی حویلی اگرچہ قدیم طرز کا نایاب نمونہ تھی - اشٹس کے بابا جان قصبے
کی اہم ترین شخصیت تھے - تقریباً آدھا قصبہ اُن کی ملکیت تھا - باقی میں علاقائی لوگ
اور سرکاری ملازمین - اُن کے گھر، دفتر، بینک، سکول، ہسپتال وغیرہ تھے -
خود اُن کی حویلی بھی بہت بڑے پہاڑی نالے کے کنارے اونچے ٹیلے پر واقع تھا
تک پھیلی ہوئی تھی ٹینس کورٹ تھا - سکواشش کورٹ تھا - شکارگاہ
تھی - اصطبل تھے - مگر جانے کیوں ؟ وہ اکثر
اپنی حویلی سے شام کے پھیلتے سایوں میں جگمگ جگمگ کرتی نرالا تک بکھرے
واقع اونچی پہاڑی پہ ایستادہ پولیٹیکل ایجنٹ کے بنگلے کو تکا کرتی -
چند ساعتوں کے لیے وہ اپنے آنسو بھی بھول گئی - اور سپنے تلے قدم اٹھاتی
پتھروں کی بنی چند سیڑھیاں چڑھ کر اپنے لان میں آ گئی - وہاں سے ہوتی کچن کی طرف آ نکلی
وہیں ماما نگ کے ساتھ لگی کھانے کی تیاری میں مصروف تھیں - "بیبی! کھانا اپنے بیڈروم
میں کھاؤ گی یا کھانے کمرے میں ؟" -
جب سے شامیں یخ ہونے لگی تھیں - وہ اکثر کھانا اپنے بیڈروم میں جلتی لکڑیوں
کی گرم گرم تپش کے آگے قالین پہ لگوا کر کھایا کرتی تھی -
"یہاں بھی لگا دیں ماما" - وہ اداس سی بولی -
اور اپنے کمرے میں چلی آئی - کھڑکی کے کھلے پردے میں سے اشٹس نے دیکھا - بنگلہ ابھی
بھی چراغاں ہو رہی تھی - آج تو نئے پی اے کا ڈنر تھا بنگلے میں - اُسے یاد آیا - جسے ڈرائیور
نے اُسے ریٹھی تو بتایا تھا -

پھر کھانا کھا نے کھاتے وہ چونکی۔ بیک میں زبردست دھوم دھڑکا شروع ہو گیا تھا۔ فوجی بینڈ زور و شور سے بج رہا تھا۔ شاید پی اے پہنچ گیا تھا۔ ہر نئے پی اے کی آمد پر یہی کچھ ہوتا تھا۔ دھوم دھڑکا، شور شرابا، اور پُر تکلف ڈنر۔

پچھلے سال وہ بھی بابا جان کے ساتھ سابقہ پی اے کی آمد کے اعزاز میں دیے گئے ڈنر پہ گئی تھی۔

رات لسٹری میں لیٹ کر اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا ناول اٹھایا۔ مگر ڈھول بجنے کا وہ شور تھا۔ کہ دو صفحے بھی نہ پڑھ سکی۔ تنگ آ کر کتاب واپس رکھ دی۔ لائیٹ آف کیا۔ اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر کہاں؟ دل میں زبردست باجوں کا طوفان آیا ہوا تھا۔ وہ پوری آنکھیں کھولے چھت کو گھورنے لگی۔ سوچوں پہ کوئی شور اثر انداز نہیں ہوا۔

وہ اطمینان سے پھر اسی کے متعلق سوچنے لگی۔

ڈھلتی سنہری دھوپ ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔ ہوا معمول کے خلاف تھمی ہوئی تھی۔ پہاڑ، میدان، ٹیلے اور اونچی نیچی ناہموار زمین سبھی سنہرے سنہرے نظر آ رہے تھے۔

حویلی کے پاس بہتا نالہ حسب معمول دھیمی رفتار سے رواں دواں تھا۔ پانی کے

بیچوں بیچ بے ترتیبی سے پھیلی شفاف ریت کے ذرے چمک رہے تھے۔
دنوں بعد آج اُس نے اپنی پینٹنگ کا سامان اپنی مخصوص پسندیدہ جگہ پر
پانی کے کنارے بھیگی بھیگی ریت پر پھیلایا تھا۔
کافی دیر بیٹھی وہ اپنے برش تیل سے صاف کرتی رہی۔ رنگوں کے ٹیوب
اور ڈبے جھاڑتی رہی۔ عرصہ کا جما ہوا سفید پینٹ کا ڈبہ صاف کر کے تارپین کا تیل
ملایا۔ دیر تک اُسے ہلاتی رہی۔ جب کام کے قابل ہوا تو کنٹرسٹ بنا کر سٹینڈ پر کینوس
کسا۔ بڑے سے برش سے ایک وائٹ کوٹ لگایا۔ پھر تھک کر برش ڈبے میں رکھا۔
پھر وہ دھیرے سے مسکرا دی۔ اتنے سے کام سے اس کا بازو دکھنے لگا تھا۔
"تم بہت نازک ہو"۔ دوسرے ہاتھ سے بازو سہلاتے جانے کہاں
سے پھر اُس کی آواز ذہن میں گونج اُٹھی۔
اور وہ پھر سے بے طرح اُداس ہو گئی۔ اُس نے ایک اور وائٹ کوٹ لگایا۔
اور اُس کے خشک ہونے کا انتظار کرنے لگی۔
"پھر بھی اتنے بڑے آدمی کو مار گرایا ہے"۔ اُس کی دھیمی دھیمی آواز اب بھی
سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔
اس کا گلہ پھر رُندھنے لگا۔
کہیں بھی تو چین لینے نہیں دے رہا تھا وہ۔ پلکیں جھپک کر وہ مختلف رنگ بنانے
میں مصروف ہو گئی۔ پھر گہرا نیلا رنگ برش پر لے کر آہستہ آہستہ کھڑی ہو گئی۔
محویت سے کینوس پر ایک کے بعد دوسرا رنگ منتقل کرنے لگی۔ اُس نے
آسمان کی نیلاہٹیں بنائیں۔ بادل جھاگتے بادل بنائے۔

"تب یہ مکمل ہو گی۔ فنشنگ ٹچ لگنے لگی۔ تو بہترین لینڈ سکیپ بن جائے گا۔"
وہ خالی برش بادلوں پر پھیرتے پھیرتے سوچتی گئی۔

"اے" جانی پہچانی آواز کے ساتھ ہی وہ اپنے کندھے پر بھاری سے ہاتھ کا دباؤ محسوس کرکے مڑی۔

اور پھر جیسے حیرت سے اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ وہ ہی تو تھا۔ بالکل وہی۔ سفید سفید ننگے پاؤں ریت میں آلودہ معلوم ہوتے تھے۔ جینز کے پائنچے اُلٹے پیٹ کر اوپر کیے ہوئے تھے۔ مزدن رنگ کی جرسی پہنی ہوئی تھی۔ سیاہ کوٹ کندھے سے لٹکا تھا۔ ایک ہاتھ میں اتارے ہوئے بوٹ تھے۔ اور دوسرے میں ابھی ابھی اس کے مڑتے ہی آنکھوں سے دھوپ کا چشمہ اتار کر وہ اسے سر سے لے کر پاؤں تک شریر نظروں سے گھورے جا رہا تھا۔

"تم ہی ہو نا۔" وہ اپنی خوبصورت بلکیں شرارت سے جھپک کر جیسے یقین کرنا چاہتا تھا کہ وہ ہی ہے۔

وہ سکتے کے سے عالم میں برش ہاتھ میں لیے کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔

"اس طرح کیا دیکھ رہی ہو۔ پہچانا نہیں کیا؟" وہ کوٹ کندھے پر سے اتار کر اس کے سٹینڈ سے لٹکاتے ہوئے بوٹ ادھر ریت پر پھینکتے ہوئے بولا۔

"آپ . . . آپ یہاں کیوں آگئے ہیں؟" وہ تو دل کی دھڑکن تسلیوں سے سلا رہی تھی۔ یادوں سے بھی چھٹکارا نہیں پا رہی تھی۔ اوپر سے یہ خود آگیا تھا۔

"تم نے آنے سے منع کر دیا تھا۔ گورنمنٹ مہربان ہو گئی۔ تمہارے نہ چاہنے کے باوجود یہاں بھیج دیا۔" وہ خوشدلی سے ہنستے ہوئے بولا۔

"اوہ" ۔ نوشابہ ۔ اسے یہی تھا۔ تم جگمگاتے پھولوں والے ریڈ شیڈ میں
میں سجنے والا۔

جانے کیوں؟ وہ مزید اداس ہو گئی۔

وہ اشعر کے لئے بیقرار ہو کر نہیں آیا تھا۔ پوسٹنگ ہوئی تھی یہاں۔ اس
لئے آیا تھا۔

"تمہیں میرا یہاں آنا اچھا نہیں لگا ہے؟" اس کے گال پر گھبرائی بالوں کی لٹ
دھیرے سے پیچھے کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

وہ جھجک کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے اپنا بے تکلفانہ رویہ ابھی تک ترک نہیں
کیا تھا۔

"میرے اچھے لگنے نہ لگنے سے کیا ہوتا ہے"۔ وہ اپنی تصویر کی طرف متوجہ
ہوتے ہوئے سپاٹ سے لہجے میں بولی۔

"اب تک ناراض ہو؟" سٹینڈ تھامے اشعر کے ہاتھ پر دھیرے سے
اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"میں کیوں ناراض ہونے لگی؟"

"پلیز اب تو معاف کر دو"۔ ہاتھ ہٹاتے ہوئے اس نے اپنا چہرہ شانی
کے ہاتھ پر ٹکا دیا۔ "مجھے تم سے شدت سے شانی۔ محبت زیادہ۔ میں نے تمہیں اس
عرصے میں کتنا یاد کیا ہے۔ تم سوچ بھی نہیں سکتیں"۔ وہ اس کے ہاتھ پر بے تحاشہ
پیار کرتے ہوئے کہتا گیا۔ "تم وہاں سے چلی آئیں ۔ تو مجھے لگتا تھا۔ میں پاگل ہو جاؤں گا۔"
وہ اپنا ہاتھ کھینچے جا رہی تھی۔ مگر وہ تو واقعی جیسے اپنے حواسوں میں نہیں تھا۔

سختی سے اُس کا ہاتھ پکڑے پیار پہ پیار کیے جا رہا تھا ۔

اُس نے پرچ ٹرے میں رکھ لیا ۔ اور دوسرے ہاتھ سے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے نکالنے کی کوشش کرنے لگی ۔ مگر ۔

اُس نے اُس کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے اُسے اپنی طرف کھینچا ۔ ایک پل کو اُس کی آنکھوں میں دیکھا ۔ اس کی نظروں کی بھرپور تڑپ کی وہ تاب نہ لا سکی ۔ نظریں پھر گھبرا کر جھک گئیں ۔

اور تبھی اُس نے بے اختیار ہو کر اُسے سینے سے لگا لیا ۔ یوں بے قرار ہو کر اُسے لپٹایا کہ اس کا دم رکنے لگا ۔ اُس نے اُس کے گالوں پر آنکھوں پر اَن گنت بے شمار پیار کیے ۔ کہ اُس کی سانسیں اُلجھنے لگیں ۔

پل بھر کو تو اُسے لگا ۔ اُس کی روح جنم جنم سے اُس کے اسی بے قرار پیار کی پیاسی ہے ۔ ایک لمحہ کو شدید ترین خواہش ہوئی ۔ وہ یونہی اُس کے سینے کی پہنائیوں وسعتوں میں کھوئی رہے ۔ جہاں کوئی اور نہ ہو ۔ جہاں کوئی دکھ نہ ہو ۔ کوئی غم نہ ہو ۔

چند لمحوں کو تو اُس نے مزاحمت بھی چھوڑ دی ۔ انداز خود سپردگی لیے اُس کے چوڑے سینے سے لپٹی ۔ اُس کی گرم گرم مہکی مہکی سانسوں میں اُس کی بے ترتیب اُلجھی اُلجھی سانسیں مدغم ہوتی رہیں ۔ مگر ۔

پھر جیسے اچانک ہی اُسے ہوش آیا ۔ پیار کا دعویٰ تو پہلے بھی کرتا تھا ۔ ایفا کرنے کا وقت آیا ۔ تو وہیں چھپ کر بیٹھ گیا ۔ جیسے اس کا وجود ہی نہ رہا ہو اس دنیا میں ۔ اب وہ کسی اور کی ہو گئی ۔ بوجہ مجبوری اُسے یہاں آنا پڑ گیا ۔

تو پھر وہی حرکتیں دہرانے لگا۔

جیسے اُس کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔ جب دل چاہا عشق جتا لیا۔ جب نہ چاہا خاموش ہو کر بیٹھ رہا۔

اب یہاں تک قیام کو رنگین بنانے کے لئے پھر ڈھیٹ بن کر چلا آیا تھا۔

تبھی وہ

ایک جھٹکے سے اُس کے بازوؤں کا حصار توڑ کر الگ کھڑی ہو گئی۔

"ابو فر کہیں گے"۔ وہ مشتعل ہو کر چلائی۔

جواب میں وہ حیران سا کھڑا اُسے تکتا رہا۔ اور

پھر دفعتاً ہنس دیا۔ وہی مخصوص ہنسی۔ وہی ڈمپل لئے۔ آبانو کا مجسم

اُس کے سامنے ایستادہ تھا۔

اس کے قدم پھر لڑکھڑانے لگے۔

"آپ۔۔۔ آپ چلے جائیں یہاں سے"۔ وہ بمشکل سنبھلتے ہوئے پھر بولی۔

"میں تمہیں دیکھنے آیا ہوں۔ چلے جانے کے لیے نہیں"۔ ایک قدم چلتا

وہ پھر اُس کے قریب چلا آیا۔

"اوہ۔ مجھے نفرت ہے آپ سے"۔ مگر اس کے لہجے میں نفرت کی

بجائے بے بسی جھلک رہی تھی۔

"اوں ہوں"۔ اُسے کندھوں سے تھام کر بغور اُس کی آنکھوں میں

دیکھتے ہوئے وہ دھیرے سے بولا۔ "تمہیں مجھ سے محبت ہے"۔ اس کا لہجہ

بھرپور اعتماد لیے ہوئے تھا۔ "مجھے شدید نفرت ہے آپ سے"۔ اس کی چوری

بچھڑ جانے کا دُہ تحمل تھا شاید۔ وہ مشتعل ہو کر بولی تھی۔
مگر لہجے میں لاچارگی اور آنکھوں میں نمی بھی سمٹ آئی تھی۔
"اپنے آپ کو برگد رہنے دیں" جو اُس نے جھنجلا کر اُسے جھنجھوڑ ڈالا۔
"چھوڑ دیں مجھے۔ چھوڑ دیں مجھے" اُس کی ثانی بچھڑتے ہوئے وہ بے بسی سے
سر اُس کے سینے پر پٹخنے لگی۔
اُس نے اُسے بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔ خاموشی سے اُس کے بال
سہلاتا رہا۔ پھر وہ چونکا۔ مزاحمت بیکار سمجھ کر وہ اُس کے بازوؤں میں لہرا سی گئی
تھی۔ شاید قوتِ مزاحمت مزید باقی نہ رہی تھی۔ تھک چکی تھی۔
"تم میری زندگی ہو۔ میری جان ہو۔ میری روح ہو۔" اُسے بازوؤں میں
جکڑتے ہوئے چہرہ اُس کے بالوں میں چھپا کر بے قرار ہو کر وہ کہتا گیا۔
اور
ثانی اُس کے سینے میں منہ چھپا کر بے بسی سے رو دی۔ پھر روتے روتے
اُس کی ہچکی بندھ گئی۔ اپنی پچھلی بے قراریوں۔ بے تابیوں۔ اُداسیوں اور
بے بسیوں کا سارا غبار نکالنے پر جیسے تل گئی۔ آنسو بہہ بہہ کر کامران کے گلے کو بھگونے
لگے۔ اور وہ بے تاب ہو ہو کر اُسے بھینچتا رہا۔
تبھی وہ چونکا۔
حسبِ معمول پرندوں کے غول اُن کے سروں پر سے گزرتے اپنے بسیروں
کی طرف چل دیئے تھے۔
"آؤ اب چلیں"۔ اُس کے آنسو اپنی انگلیوں پر اٹھاتے ہوئے اُس نے

بڑی دلنشیں مسکراہٹ سے کہا۔

"کہاں ہے؟"

"یہاں"۔ اس نے شرارت سے اپنے جگنوؤں کے مسکن کی طرف اشارہ کیا۔

وہ دھیرے سے الگ ہو کر کھڑی ہو گئی۔

"تو تمہیں مجھ سے نفرت ہے؟" اشعر کے بال آہستہ سے سنوارتے ہوئے اشعر نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔

چند لمحے وہ چپ سی رہ گئی کہ تڑپ تڑپ کر اشعر کا رونا اس کے کھلے پیار کی دلیل ہی تو تھا۔ مگر۔

"مجھے آپ سے پیار بھی نہیں ہے۔" باوجود کوشش ضبط کے اشعر کا لہجہ شاکی اور انداز سزادہی لئے ہوئے تھا۔

"جھوٹ نہیں بولا کرتے"۔ اس نے آہستہ سے اپنی انگلی اس کے خوبصورت ہونٹوں پر رکھ دی۔

"میں گھر جاؤں گی"۔ وہ ٹرے پر سے سامان سمیٹنے لگی۔

"کس کے گھر؟"۔ وہ اس کا ساتھ دیتے ہوئے پھر شوخی سے بولا۔

"اپنے گھر"۔ وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

"تو پھر چلو"۔ اسے ہاتھ سے تھامتے ہوئے اشعر نے قدم اپنے ریڈیو کی طرف بڑھائے۔

"میں اپنے گھر کی بات کر رہی تھی"۔ ہاتھ چھڑا کر وہ پھر اپنے برش تیل کے ڈبے میں رکھنے لگی۔

"تمہارا گھر یہی تو ہے"۔

"میرا گھر یہ ہے"۔ اس نے اپنی حویلی کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ تمہارے بابا جان کا گھر ہے"۔

"میں بابا جان سے الگ ہوں کیا؟" اُسے ہنسی آگئی۔

"شوہر کا گھر لڑکی کا اپنا گھر ہوتا ہے بابا جان کا نہیں"۔ وہ شوخی سے بولا اور اُسے پھر اداسیوں نے آلیا۔

سامان اکٹھا کر کے اس نے جانے کے لئے قدم بڑھائے۔

"یہ چیزیں چھوڑ جاؤ گی؟" وہ بھی اپنا کوٹ اور بوٹ لے کر اس کے سامنے آگے بڑھ آیا۔

"نوکر آکر لے جائے گا"۔

"کون اٹھا کر لے گیا تو؟" وہ اطمینان سے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ چلتا گیا۔

کیا کر رہے ہیں؟" اس کا ہاتھ جھٹک کر وہ آگے بڑھنے لگی۔

عجیب تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ سیڑھیاں چڑھتا اس کے گھر گھسا آرہا تھا۔ کوئی دیکھ لیتا تو؟

"آپ ..... آپ ....." وہ رک گئی۔ "کوئی دیکھ لیگا ....."

"مجھے کوئی نہیں دیکھتا"۔ وہ اطمینان سے کہتا چلا آرہا تھا۔

"آپ تو ہیں ہی ڈھیٹ"۔

اور جواب میں ایک خوشگوار قہقہہ لگاتے ہوئے وہ اوپر لان میں آگیا۔

"ارے میم۔ تو چلیں کہاں ؟" وہ اُسے برآمدے کی طرف تیز تیز چلتے دیکھ کر پیچھے سے پکار بیٹھا۔ "میرے پاؤں دھلوا دو۔ اتنا راستہ کیا میں ننگے پاؤں جاؤں گا۔" وہ وہیں ٹھنڈے اندھیرے میں اطمینان سے لان چیئر پر بیٹھ گیا۔

اور وہ مزید جھنجھلا اٹھی۔

کیا وہیں نالے میں نہیں دھو سکتا تھا ؟ وہ پاؤں پٹختی کچن سائیڈ پر گئی۔

"اسلم بابا! باہر جو صاحب لان میں بیٹھے ہیں۔ انہیں مہمان خانے میں لے جائیں۔ پاؤں دھوئیں گے۔"

کہتے ہی وہ کچن سے نکل گئی۔ وہ اس کا عجیب سا مہمان تھا۔ خدا سے محبت نکل جانے کو کہہ سکتی تھی۔ نا ہی اس کی کوئی مہمانداری کر سکتی تھی۔

پہلی بات میں دل کے تقاضے آڑے آتے تھے۔ تو دوسری میں۔ دنیاوی باتیں۔ اور منگنی کے بعد کسی اور کی ملکیت ہونے کا لحاظ تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی سیڑھیاں چڑھتی اپنے کمرے میں آگئی۔ کھڑکی کے پٹ سے ٹیک لگاتے ہوئے وہ بے سدھ سی ہو گئی۔ جیسے میلوں بھاگ بھاگ کر آئی ہو۔

اس نے نیچے دیکھا۔ اسلم بابا کے ساتھ وہ مہمان خانے کی طرف جاتا بہت ہموار نظر آ رہا تھا۔ وہ یوں ہی کھڑکی میں کھڑی اسی طرف دیکھتی رہی۔

تھوڑی دیر بعد وہ باہر نکلا۔ پیچھے اسلم بابا بھی تھے۔

"صاحب! چائے کوئی تو پیتے جائیں؟"

"اوہ۔ شکریہ۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔" اس کے کمرے کے عین نیچے سے گزرتا کوٹ پہنتے ہوئے وہ بولا۔

"صاحب! چھوٹی بی بی ناراض ہوں گی۔"
اور شاید اسلم بابا کی بیوقوفی پہ غصہ آ گیا۔
"وہ کیوں ناراض ہوں گی؟" وہ حسبِ عادت شرارت سے بولا تھا۔
"آپ ان کے مہمان ہیں نا۔"
"گھر والا ہوں۔ مہمان نہیں ہوں۔ سمجھے بابا۔"
"صاحب ۔۔۔" اسلم بابا تو اس کی توضیح کی فکر میں تھے۔ اس کی بات پر کب دھیان دے رہے تھے؟
"پھر کسی وقت صحیح"۔ وہ لان کے آخری سرے کی طرف جانے لگا۔
"اب اجازت دو بابا۔"
"سلام صاحب"۔ اسلم بابا متاثر سے نظر آ رہے تھے۔
"سلام بابا"۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے بابا کے سلام کا جواب دیا۔ اور تیز تیز قدم اٹھاتا سیڑھیاں اتر کر اندھیرے میں آگے بڑھ گیا۔

کرنل اشتیاق کے یہاں ڈنر تھا۔ وہ بھی انواٹیڈ تھی۔ آرمی کے سبھی آفیسرز۔ ان کی فیملیز کے علاوہ علاقے کے چیدہ چیدہ لوگ بھی شامل ہوئے تھے۔

آنچ پھر وہ سب سے نمایاں تھا شخصیت میں۔ لباس میں گفتگو میں۔

اور۔

انس نے سوچا۔ زندگی کتنی مشکل ہو کر رہ گئی تھی۔ ایک طرف منگنی کا بندھن۔ دوسری طرف دل کے تقاضے۔ وہ تو ہر ممکن کوشش کر رہی تھی مجھے دل سے بھلانے کی۔ نہ بھی مقبول پاتی۔ تو بھی کسی اور کی ہو کر چلی جاتی۔ بھول ہی جاتی۔ شاید ہمیشہ کے لیے۔

یہ تو پیچھے ہی چلا آیا تھا۔ وہ تو اب بھی قطع تعلق کیے بیٹھی تھی۔ اگر وہ پیچھا چھوڑ دیتا تو۔ ان کا آپس میں تعلق ہی کیا تھا؟

مگر

کرنل اشفاق کی جوان بیٹی بہانے بہانے انس کے قریب جانے لگی۔ تو وہ چونک اٹھی۔ وہ اپنے دل میں چھپی چبھن کو صاف محسوس کرنے لگی۔ وہ بری طرح جل اٹھی تھی۔ وہ انس کی بات کا مسکرا کر جواب دیتا۔ تو وہ واضح طور پر اپنا دل جلتا محسوس کرتی۔ اگرچہ یہ کوئی قابل گرفت حرکت نہیں تھی۔ لڑکی آزاد ماحول کی پروردہ تھی۔ بار بار اسے ہی متوجہ کرنے کی کوشش میں لگی تھی۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ اس کی باتوں کا جواب وہ مسکرا مسکرا کر دے رہا تھا۔ یہ ایٹی کیٹ میں شامل تھا۔ مگر پھر بھی معلوم نہیں کیوں؟ وہ واضح طور پر بے چینی محسوس کر رہی تھی۔

واپسی پر انس نے پیدل آنا تھا۔ قریب ہی تو تھا گھر۔ مگر اوہ پھر اسے اصرار کر کے بلکہ زبردستی کر کے کار میں بٹھانے لگا۔ وہ اس بات سے تو چار رہا تھا۔ پھر کیوں وہ پیدل جاتی۔

"آگے بیٹھ جاؤ آگے۔ پیچھے تو لوگ ڈرائیور کے ساتھ بیٹھتے ہیں" پچھلی سیٹ کے لیے اس کا ارادہ بھانپ کر اس نے ہاتھ سے پکڑ کر زبردستی اگلی سیٹ پر بٹھاتے ہوئے اس نے کہا۔

اور وہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔ کہ وہ پہلے بھی کبھی اُس سے زبردستی کی تھی۔

"سناؤ کیا حال چال ہیں؟" گاڑی سٹارٹ کرتے ہی وہ سامنے دیکھتے ہوئے بولا۔

وہ خاموش رہی۔

"بیگم صاحبہ! اب تو تم بلا خاصی خوشامدیں کروائی ہیں اُس دن" وہ خوشدلی سے مسکراتے ہوئے پھر بولا۔

مگر وہ خاموشی سے کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔

"یہ اندھیرے مجھ سے زیادہ اچھے ہیں؟" اس کا ہاتھ ہاتھ میں لے کر اس نے سٹیرنگ وہیل پر رکھ دیا۔

"اگر میں آپ کو ایک بات بتا دوں۔ تو آپ یقیناً میرا پیچھا چھوڑ دیں گے" وہ اچانک اس کی طرف مڑتی ہوئی بولی۔

اس نے سوچا اُسے اپنی منگنی کا ضرور بتائے گی۔ اس طرح وہ بھی اپنی حرکتوں سے باز آجائے گا۔ اور وہ بھی شاید ایک گونہ سکون پا سکے گی۔

اور وہ زور سے قہقہہ لگا بیٹھا۔

"ویسے میں پہلے سے بتا دوں۔ کہ تمہیں چھوڑنے والا نہیں ہوں" وہیل پہ رکھے اس کے ہاتھ پر اپنی گرفت مزید مضبوط کرتے ہوئے اس نے کہا۔

"میری منگنی ہو چکی ہے" اس نے دھیرے سے کہا۔

"اوہ" ۔ اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

"کب؟"

"پچھلے مہینے"۔

"کس سے؟"۔

"بابا جان کے دوست کے بیٹے سے"۔

"کرتا کیا ہے؟" ۔ اس کا ہاتھ خود ہی ڈھیلا پڑنے سے اٹھا کر اس نے سینے پر رکھ دیا۔

اور اپنی یہ سکیم بھی اسے ناکام لگی۔ اس نے اس کا ہاتھ ڈھیلا پڑنے نہ دے تو دوسرے طریقے آزما رہی تھی۔

"سی۔ ایس۔ پی۔ ہے"

"تم ملی ہو اس سے؟"۔

"نہیں"۔

"کبھی دیکھا ہے؟"

"نہیں"۔

"کوئی تصویر وغیرہ؟"

"نہیں"۔

"اور چلی ہو اس سے شادی کرنے؟"

"ہاں" ۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے ہنسی آ گئی۔

"خوش ہو اس منگنی سے؟" ۔ قدرے توقف کے بعد اس نے پھر پوچھا۔

"باباجان کی خوشی میری خوشی ہے"۔ وہ دھیرے سے بولی۔
"لیکن تمہارا دل الگ اور باباجان کا الگ ہے"۔
"باباجان نے پوچھا تھا مجھ سے"۔
"اوہ"۔ وہ کچھ اداس سا نظر آنے لگا۔ "تم اُسے پسند کرتی ہو کیا؟"
تش نے ایک گہری نظر اس پہ ڈال کر پوچھا۔
"شاید"۔
"شاید سے کیا مطلب؟ تم اپنے دل کا حال نہیں جانتیں کیا؟"۔ وہ کچھ جھنجلایا سا بولا۔
"جانتی ہوں"۔
"پھر؟ کیا کہتا ہے؟"
سنائی خاموش ہو رہی۔
اس کا بھی موڈ آف ہو چلا تھا خاموشی سے ڈرائیو کرنے لگا۔
"نام تو آتا ہوگا غالباً؟" تدرے توقف کے بعد وہ سامنے دیکھتے ہوئے پھر کہنے لگا۔
"ہاں"۔ وہ اُس کے لب و لہجے پہ دھیرے سے مسکرا دی۔
"مجھے بتاؤ گی؟"
"اس کا نام کامران ہے"۔
"ہوں"۔ اس نے گہری سانس لی۔ "شکر ہے نام تو آتا ہے"۔
اُن کی حویلی قریب آگئی تھی۔ کار کی ہیڈلائٹس دیکھتے ہی چوکیدار نے گیٹ کھول دیا۔

"بیلیں اتار دیں۔ منگنی کے بعد وہ کچھ محتاط سی ہو گئی تھی۔ اپنے نوکروں کے سامنے کسی غیر مرد کے ساتھ گھر کے اندر آنا اُسے اچھا نہ لگا۔

"کیا بات ہے۔ منگنی کے بعد احتیاط بہت کرنے لگی ہو؟" وہیں گاڑی روک کر اُس نے دھیرے سے کہا۔

وہ چپ رہی۔

"بہت ڈرتی ہو۔ کامران سے"

شانی نے نظر اُٹھا کر اُسے دیکھا اور بس۔

"پھر بھی میم صاحب۔ منگنی ہو جائے تمہاری چاہے شادی۔ ان دھمکیوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں ایسی باتوں سے ڈرنے والا نہیں۔" وہ اترنے کے لیے دروازے کی طرف بڑھی ہی تھی۔ کلائی سی چوڑی سے پکڑ کر اُسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے اُس نے کہا۔

"چھوڑ دیں مجھے نہ جانے کیوں؟ اپنی سکیم فیل ہوتے دیکھ کر وہ دل برداشتہ سی ہو گئی۔ آواز گلے میں رندھ گئی۔ اور۔ آنکھیں ایکبار پھر نم ہو گئیں

"اچھا جاؤ۔" جلدی جلدی سے اُس کی دونوں بھیگی بھیگی آنکھوں پر پیار کرتے ہوئے اُس نے اُسے چھوڑ دیا۔

چند قدم پر گیٹ اور گیٹ کھولے چوکیدار کھڑا تھا۔ اُسے زیادہ دیر رکنا مناسب نہیں تھا۔

وہ کچھ کہے بغیر گیٹ کی طرف بڑھی۔ پھر اُس نے مڑ کر بھی نہ دیکھا کب تک وہ کھڑا اُس کے گیٹ کے اندر داخل ہونے پھر گیٹ کے بند ہونے کا منتظر تھا۔

وہ سیدھی اپنے کمرے میں آ گئی۔ اپنے کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ بمشکل کپڑے تبدیل
کئے بغیر بستر پر پڑتے ہی بے تحاشہ رو پڑی۔ کیسی آزمائش میں پڑ گئی تھی اُس کی ذات۔
دن یونہی گزر رہے تھے۔ کرب میں بے چینی میں۔ چند دن قبل کامران نے
اُسے لکھا تھا۔ کہ وہ اُسے ملنے آ رہا ہے جو تاریخ اُس نے لکھی تھی آنے کی۔ اُس
حساب سے وہ آج پہنچنے والا تھا۔ کس وقت پہنچے گا۔ یہ تو شاید لکھا ہی نہیں تھا۔
کہاں سے آئے گا؟ یقیناً دبئی سے۔ جہاں سے خط لکھا کرتا تھا۔ آخری دو خطوط
پر تو وہ جگہ لکھنا ہی بھول جاتا تھا شاید۔ اب تو وہ اُسے جواب بھی تیسرے چوتھے
خط کے بعد ہی دیتی۔ اُس کا البتہ اُس کے جواب کا انتظار کئے بغیر تقریباً ہر ہفتہ
ایک خط آ ملتا۔ چند دن قبل اُس نے اُسے خط کا جواب دیا تھا۔ جو اُس
کے کہنے کے مطابق وہ ابھی تک اُسے اُس کے PARENTS کے ایڈریس
پر خط لکھا کرتی تھی۔

بہرحال کس وقت پہنچ رہا تھا؟ کہاں سے آ رہا تھا؟ اُسے کوئی سروکار
نہ تھا۔ وہ تو بلکہ آج معمول سے کہیں زیادہ اداس اور خاموش خاموش تھی۔
کچھ نادم نادم سی بھی۔

اُسے خطوں کا جواب دیکر دھوکے میں رکھے ہوئے تھی کیسی عجیب سی حالت
ہو گئی تھی اُس کی۔ اُسے بھی دھوکہ دے رہی تھی۔ خود کو بھی دھوکے میں رکھے
ہوئے تھی۔

چند ماہ قبل کی اور اب کی اپنی حالت کا وہ موازنہ کرتی۔ کس قدر بے فکر اور
حسین دن تھے۔ کاش! وہ ادھر تبدیل ہو کر نہ آتا۔ کاش! ابتدا ہی نہ ہوتی

اس میٹھے درد کی۔ پھر آج وہ کتنے خلوص سے بابا جان کی مرضی کے مطابق کامران کو اپنا تی۔ اسے کوئی دکھ ہوتا۔ نہ کوئی جبر۔ نہ کوئی غم۔

اس نے اُس کی آمد کا ماما سے بھی ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ تو اس کے نام سے گھبرائی تھی۔ ماما تو سارا گھر ہی سر پہ اُٹھا لیتیں۔ تیاریاں شروع کر دیتیں اُس کے استقبال کی۔ گھر کا ہونے والا اکلوتا داماد جو ہوتا۔

شام کے پانچ بج چکے تھے۔ وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ خاموشی سے لان عبور کر کے وہ تالے کی طرف کی سیڑھیاں اُتر گئی۔ پھر دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتی سوچوں میں کھوئی وہ خاصی دور نکل آئی۔

تبھی اس نے دیکھا۔ جہاں تالے کا پانی کم گہرا تھا۔ وہیں سے وہ پہلے پُل والے حصے میں پانی میں ننگے پاؤں رکھتا چلا آرہا تھا۔ ایک پل کو اس کا جی چاہا۔ پلٹ کر تیزی سے واپس بھاگ جائے۔ مگر اس نے دور ہی سے اُسے دیکھ لیا تھا۔

"ہیلو شائی جانی!!" دور سے ہاتھ ہلاتے ہوئے وہ خوشدلی سے بولا تھا۔

اور پھر وہ بھی رُک گئی تھی۔

"کیسی ہو؟" اس کے قریب پہنچتے ہی اپنا کندھے سے لٹکا کوٹ شائی کے دونوں کندھوں پہ ڈالتے ہوئے وہ مسکرا کر پوچھنے لگا۔

"ٹھیک ہوں" وہ اُداسی سے مسکرا دی۔

"جھوٹ کہہ رہی ہو۔ بلکہ تم تو شکل سے اُداس لگ رہی ہو" وہ پھر بغور نظر

سے اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

"نہیں تو"۔ وہ پلکیں جھپکنے لگی۔

"بتاؤ نا کیا بات ہے؟"۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھتے ہوئے اپنائیت سے پوچھنے لگا:

"کچھ نہیں"۔ اور ساتھ ہی اٹھنے لگا۔ اس نے مزید پوچھا تو وہ رو دی تھی۔

"مجھے بھی نہیں بتاؤ گی؟"۔ اس نے مزید کہا۔

"آپ کیا بہت خاص چیز ہیں؟"۔ مسکرانے کی کوشش میں اس کی آنکھیں چھلک گئیں۔ "خاص نہیں ہوں؟"۔

اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے دو موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے اس کے خوبصورت گالوں پر لڑھک دیے۔

"شانی! تم اس منگنی سے خوش نہیں لگتیں"۔ وہ اس کی روتی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اچانک بولا۔

اور تبھی شانی کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔

"نہیں یہ بات نہیں ہے"۔ وہ اپنی نازک انگلیوں سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

"تمہاری انگوٹھی بہت خوبصورت ہے"۔ اس کی نظر اس کی انگلی میں چمکتی انگوٹھی پر پڑ گئی۔

"منگنی کی ہے"۔ اس نے دھیرے سے کہا۔

"تمہیں بہت اچھا لگا ہے؟"۔

"یہ آپ نے کیسے جانا؟"۔ وہ پھر سے اداس ہونے لگی۔

"انگوٹھی جو تم نے رکھنی ہو۔"

اور اُس نے خاموشی سے نظریں جھکالیں۔

"آج آرہا ہے وہ" جیسی پلکیں جھپکتے ہوئے اُس نے بالکل یوں کہا۔ جیسے ایک

مخلص دوست سے حالِ دل کہہ رہی ہو۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"خط آیا تھا؟"

"تمہارے پاس؟"

اُس نے سر اقرار میں ہلادیا۔ جیسے پہنے سے اُس کے سامنے "ہاں" کہتے ہوئے

جھجک مانع ہو۔

"تم بھی اُسے لکھتی ہو؟" وہ اچانک پوچھنے لگا۔

جانے کیوں؟ وہ گھبرا سی گئی۔ اُس سے پیار تھا۔ اور اپنے پیار کا خیال تو رکھا

ہی جاتا ہے۔

وہ خود ہی کچھ گیا۔

"تم نے کیا لکھا اُسے کہ آجاتے ملنے تمہیں؟"

"نہیں تو۔ میں نے کبھی بھی اُسے ایسا نہیں لکھا۔"

"تم خوش ہو اُس کے آنے پہ؟"

اور وہ افسردگی سے مسکرادی۔

اُس نے کبھی جھوٹ بولے تھے۔ آج جانے کیوں؟ مزید

جھوٹ نہ بول سکی۔ چپ ہی رہ گئی۔

"کس وقت آئے گا؟"

"شاید ابھی آجائے۔ یا پھر آ بھی چکا ہو۔ میں تو یہاں آ نکلی ہوں۔" وہ اداسی سے کہتی گئی۔

"تم اسے پہچان لو گی؟"

"وہی آج آنے والا ہے۔ جو بھی یہاں آ گیا خاص ہے۔۔۔" وہ معصومیت سے کہہ رہی تھی۔

"جو بھی آ گیا؟ میں بھی تو آیا ہوں۔"

"نام بھی بتا دیا تھا نا۔" وہ اداسی سے ہنس دی۔

"کامران۔ کامران نام ہے نا؟" وہ بغور اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

"آپ کے پاس اور کوئی Tape نہیں ہے؟" غیر ارادی ان کے منہ سے نکلا۔

"اوہ۔ آؤ اس طرف واک کریں۔" وہ حویلی سے ملحقہ لان سیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"نہیں ٹھیک ہے۔" وہ پہلے ہی گھر سے خاصی دور نکل آئی تھی۔ اب [illegible]

"اوہ۔ آئی ایم سوری۔ بیٹھیں لیجئے" اس نے کہا "انتظار ہو گا۔" اس کے طنزیہ لہجے میں بھی اداسی شامل ہو گئی۔

اور شانی اس کی اداسی بھانپ کر پہلے سے کئی گنا زیادہ اداس ہو گئی۔

"جانے کیوں؟ مجھے انتظار نہیں ہے۔ مجھے وہ۔۔۔ میں اداس ہے۔۔۔"

بے ربط سے ادھورے فقروں کے ساتھ ہی اس کے چہرے [illegible] ۔

"کیا بات ہے شانی! لگتا ہے تم کچھ چھپا رہی ہو۔ کبھی لگتا ہے۔۔۔ کچھ"

بتانے چلی ہو۔" وہ اپنا ئیت سے اس کے دونوں بازو اپنی کمر کے گرد لپیٹتے ہوئے
کہنے لگا۔

اور شانی اس کی قربت پاتے ہی بے اختیار ہو گئی۔

"مجھے۔ مجھے اس کا انتظار نہیں ہے۔۔۔۔ مجھے وہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

مجھے۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔" اور
اس کے چوڑے سینے پر سر رکھ کر وہ ہچکیاں لے لے کر رو دی تھی۔ آج ضبط
کے سارے بند ٹوٹ ہی تو گئے۔
وہ اُسے پسند نہیں کرتی تھی۔ اس کا پیار تو اس کے سامنے موجود تھا۔ مگر اب یہ
صبر و ضبط کا بارِ گراں اُسے تھکا سا چکی تھی۔ اس کی آمد کی خبر جیسے آخری بوند تھی۔

اور۔

پیمانہ چھلک ہی پڑا۔
"میں اس کا انتظار نہیں کر رہی۔ مجھے اس کا انتظار نہیں ہے۔۔۔ میں۔
۔۔۔ میں۔۔۔"

اور کامران نے اُسے بازوؤں میں بھر کر سینے میں سمو لیا۔
"میں مر جاؤں گا تمہارے بغیر۔ مر جاؤں گا۔ تم میری روح ہو شانی۔ میری
جان ہو۔" اس کے خوبصورت چہرے پر ان گنت پیار کرتے ہوئے اس نے اُسے
سینے کے ساتھ یوں جکڑ لیا تھا۔ جیسے اُسے کوئی لے ہی تو جائے گا۔
اور شانی کی سانسیں ایک بار پھر اُلجھنے لگیں۔

مگر۔ اس نے مزاحمت نہیں کی بھلی نہیں بیخود نہیں بجایا۔ چپ چاپ اس کے سینے سے لگی جھکیاں لیتی رہی۔

شام گہری ہو چلی تھی جگنوؤں کے مسکن میں جھم جھم جھم ہونے لگی تھی اس نے دھیرے سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ گہری گمبھیر چہرے پر لئے وہ اسے تک رہا تھا۔ "دل کی بات بتا دیا کرتے ہیں۔ یوں چھپ کے کیا سوچا جاتا ہے" وہ نرمی سے بولا مہ پرکشش ہونٹوں پر چہرے پر مخصوص تبسم بکھر آیا تھا۔ اور آنکھیں محمل کی طرح شوق سے تکنے لگی تھیں۔

تبھی آنسو پونچھتے پونچھتے اسے احساس ہوا۔ یہ اس نے کیا کر دیا تھا۔ یہ اس کا راز تو اسے بتا ہی دیا تھا۔ یہ تو وہ سمجھ ہی گیا تھا۔ کہ وہ اپنے منگیتر کی منتظر نہیں ہے۔ کہیں اُن کا آدھا بھی وہ جان تو نہیں گیا تھا۔ وہ سمجھ تو نہیں گیا تھا۔ کہ اس کا پیار وہ ہی ہے۔ اس نے

پھر اس کی طرف دیکھا۔

دل نشیں مسکراہٹ ہونٹوں پر لئے وہ اسے تک رہا تھا۔

"آؤ نینی گھر چھوڑ آؤں۔ تمہارا مہمان آ چکا ہوگا۔ ہو سکتا ہے تمہارے پہنچتے پہنچتے وہ چلا بھی گیا ہو" اس کا ہاتھ تھامے ہوئے وہ آگے بڑھنے لگا۔ اور وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

آ بھی گیا ہوگا۔ چلا بھی گیا ہوگا۔ کیا کہہ رہا تھا وہ؟ "خدا حافظ"۔ اسے لان کی سیڑھیوں تک پہنچاتے ہوئے اس نے دھیرے سے اپنے ہونٹ اس کے نازک سے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔

"آپ بار بار بھول جاتے ہیں کہ میری منگنی ہو چکی ہے۔ اپنا یا اقتدار آپ سند ہے"
چچیرا کزن انیس نے مومی سے کہا۔
"دیکھا جائے گا۔" انیس نے خوشدلی سے جواب دیا۔ "شاباش" یا مختصر
جاتے ہوئے وہ اپنے ونڈ شیلڈ کے راستے پر ہو لیا۔

اسے کل سے بخار آرہا تھا۔ ٹھنڈ لگ گئی تھی شاید۔ ماما نے ڈاکٹر بلوا کر دکھایا تھا۔ اور دوائیاں اس نے شروع کرلی تھیں۔ مگر طبیعت ابھی تک مضمحل ہی رہتی تھی۔

ماما کی زبانی آنٹی افتخار کو معلوم ہوا۔ تو دوڑی چلی آئیں۔ کافی دیر تک اس کے پاس بیٹھیں اس کا سر دباتی رہیں۔ ساتھ ہی ساتھ کئی گھریلو نسخے بتاتی گئیں۔ ڈاکٹروں کی تیز اور سرگرم دواؤں کی مذمت بھی کرتی رہیں۔ پھر چائے پیتے پیتے باتوں کا رخ اڑوس پڑوس کی طرف جا نکلا۔

"کل کرنل اشفاق کی بیگم نے نئے پی اے کو چائے پر گھر بلایا تھا۔" وہ جیسے رازداری سے کہنے لگیں۔

"کرنل اشفاق صاحب کی بیگم نے؟" ماما کچھ حیران سی ہو لیں۔
اور شانی کا دل بے ترتیبی سے دھڑک اٹھا۔ نا کہ جلیس بخش ہی کی گی
"ہاں۔ ہاں۔ صرف پی اے صاحب کو ہی بلایا تھا۔ میں اچانک چلی گئی

تھی، مجھے تو لگتا ہے کچھ بیٹی کا چکر ہے۔ لڑکی بنی سنوری چائے پیش کر رہی تھی۔" اور
شانی کو ایک بار پھر دل جھینپتا سا محسوس ہو رہا تھا۔ باتوں کا رخ اب دوسری طرف پھر گیا تھا مگر
شانی کے دکھوں میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ پھر وہ جھنجھلا اٹھی۔ کیا ہو گیا تھا اُسے۔ جب
شادی کسی اور سے ہونے والی تھی۔ ول اگر کسی کو چاہتا تھا۔ پھر وہ کرنل کی بیٹی کو لفٹ دینے
بھی لگا تھا۔ تو وہ کیسے منہ سے نکال سکتی تھی۔

مگر

"وہ تو اُس سے پیار کا دعویٰ کرتا تھا،" دل نے کہا۔
"لیکن پھر بھی وہ اُس کا پابند تو نہیں ہو سکتا تھا جبکہ اُسے معلوم تھا کہ وہ کسی اور
سے وابستہ تھی۔ کسی کو لفٹ دینا چاہے کچھ بھی کرتا۔ اُس کا پابند تو نہیں تھا نا۔" ذہن
نے دلیل پیش کی۔ "مگر اُس سے پیار جو جتاتا تھا۔" دل نے پھر احتجاج کیا۔
"کرتا ہوگا پیار۔ مگر پابند نہ ہونے کی صورت میں زیادہ تر ادھر دل لگی کر رہا تھا۔
ابھی جب اس کا تصور بھی تو نہیں تھا۔" پھر ذہن نے کہا۔
آنسی انتظار خاص کی تھیں۔

ماما نے رات کا کھانا اُس کے بستر کے پاس ہی منگوا لیا تھا۔ وہ تکیوں
کے سہارے پشت ٹکائے ہوئے بیڈ پر بیٹھ گئی۔ ماما نے اُس کے سامنے نیپکن
بچھایا۔ پھر خالی پلیٹ اُس کے سامنے رکھی۔ اور اُسکی پسندیدہ ڈش میں سے مرغ
گوشت اُس کی پلیٹ میں ڈالا۔
اُس نے نوالہ توڑا۔
"بابا کہاں ہیں ماما؟" وہ چڑچڑے پن سے بولی۔

"یہ نہ کھاؤ بھنا گوشت کھاؤ"۔ پلیٹ اشنی کے سامنے سے ہٹا کر دوسری خالی پلیٹ رکھنے لگیں۔

"نہیں کھاؤں گی"۔ وہ مزید چڑچڑا کر ان کا ہاتھ پرے کرتے ہوئے بولی۔

"کچھ تو کھاؤ ثنائی بیٹے۔ خالی پیٹ دوا کھانا ٹھیک نہیں۔ اور تم نے ڈھیر ساری دوائیں کھانی ہیں ابھی"۔ وہ شفقت سے بولیں۔

وہ دیکھ رہی تھیں۔ کچھ دنوں سے ثنائی کا مزاج بہت چڑچڑا ہو گیا تھا جانے کیا وجہ تھی۔

"دوائیں بھی نہیں کھاؤں گی"۔ اس کی آواز بھرائی۔

"ارے کیسی بچوں والی بات کر رہی ہو۔ دوائی کیوں نہیں کھاؤ گی"۔

"بس کہہ جو دیا"۔ اور آنسو ڈھلک کر اس کے گالوں پر آ رہے۔

ماما حیران ہو کر اس کا منہ تکنے لگیں۔

کیا ہو گیا تھا اسے؟ حساس تو وہ شروع سے تھی۔ بڑوں کی باتوں میں نقص نکالنا اشنی کی بالکل عادت نہیں تھی۔ نوکر تو اس کے گن گاتے تھے۔ اس کی اچھی عادتوں کی وجہ سے اشنی کی راہ میں آنکھیں بچھاتے تھے۔

"اچھا لو، پڈنگ کھا لو تھوڑی سی"۔ وہ بے حد پیار سے بولیں۔ "خالی پیٹ دوا کھانا ٹھیک نہیں"۔

"نہیں کھاؤں گی ماما، نہیں کھاؤں گی"۔ وہ گھٹنوں پہ سر رکھ کر بے اختیار ہو کر رو دی۔

ماما نے میز پرے ہٹا دی۔ اور پھر اشنی کے قریب بیٹھ کر اس کا سر سہلاتے

بے بوں کے پودے بھی تھے ۔ چند ایک سدابہار درخت بھی نظر آرہے تھے ۔ جہاں تو درخت کے علاوہ بھی یہاں کوئی سبزہ یا پھول نظر آتا تھا ۔

اس نے ادھر ادھر دیکھا ۔ کوئی نظر نہ آیا ۔ وہ سیدھی لائبریری کی طرف بڑھی ۔ دروازے پر ہی ایک چوکیدار نے مؤدب طریق سے سلام کرتے ہوئے ان کے لئے دروازہ کھولا ۔ سبھی آتے جاتے تھے ۔ اور بہت عزت دیتے تھے ۔

دھیرے سے شکریہ کہتی وہ دبے قدموں آگے بڑھ گئی ۔

کھڑکی کا پٹ سے کھل گئی ۔ یخ بستہ ہوا کا جھونکا اندر آیا ۔ آ سے جھرجھری سی آگئی ۔ اٹھ کر اس نے کھڑکی کے کھلے پٹ بند کرتے ہوئے چٹخنی لگا دی ۔

واپس کرسی پر بیٹھنے لگا تھا کہ نظریں دوسرے پورشن میں کتابوں کے شیلف میں کچھ تلاش کرتی شانی پر پڑگئیں ۔ خوبصورت مسکان خود بخود ہی اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی ۔

واپس اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے اس نے میز سے TIME کا تازہ پرچہ دیکھنا شروع کیا ۔ مگر

اب کے میز پر نہیں رکھا ۔ وہیں گود میں رکھ کر سر میز پر جھکتے ہوئے نیچے گود میں رکھے کھلے میگزین کو تکنا لگا ۔ مگر

اب ۔ اسے کچھ نہیں آرہی تھی ۔ کہاں سے اس نے چھوڑا تھا اور اب کہاں سے پڑھنا تھا ؟ ۔

اس نے انکھیوں سے دیکھا ۔ شانی دھیرے دھیرے مختلف شیلفوں پر نظریں دوڑاتی اس پورشن میں آرہی تھی ۔

وہ اب بھی کھڑکی کے قریب بیٹھا ایک بڑی سی الماری کی اوٹ میں تھا ۔

ٹہلتی ٹہلتی وہ اُسی الماری کے پاس آ گئی۔ پھر اُسی چھوٹے سے کیبن نما جگہ میں آ گئی۔ اُس کی پشت اب بھی کامران کی طرف تھی۔

وہ سر جھکائے جھکائے ہنس دیا۔

وہ بالکل اُس کے قریب آ گئی۔ اب بھی اُس کی طرف پیٹھ تھی۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟" وہ سر اٹھاتے ہوئے دھیرے سے بولا۔

اور وہ یوں اچھلی۔ جیسے اُس کی دھیمی آواز نہیں کوئی دھماکہ ہوا ہو۔

"اتنا ڈرتی کیوں ہو؟" رسالہ میز پر رکھتے ہوئے اُس نے اُسے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے قریب کھینچ لیا۔

"میں کیوں ڈروں گی؟" وہ ہاتھ چھڑانے لگی۔ اُس کا لہجہ روکھا روکھا سا تھا۔

"چلو میں ڈروں گا۔ مگر ہاتھ نہ کھینچو۔" وہ گرفت مضبوط کرتے ہوئے بولا۔

وہ سپاٹ سی نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔

وہ کچھ حیران سا ہوا۔ آج وہ چند دن قبل کی طرح نرمی نہیں برت رہی تھی۔

"بیٹھو نا۔" وہ اُسے اپنے دائیں طرف والی کرسی پر بٹھاتے ہوئے بولا۔

"میں کتابیں دیکھنے آئی ہوں۔" اس کا ہاتھ اب بھی اُس کی گرفت میں میز پر رکھا ہوا تھا۔

"بڑی دیر سے دیکھ رہی ہو۔ اب بیٹھو۔"

تو وہ اُسے خاصی دیر سے دیکھ رہا تھا۔ اُسے پھر خیال آیا۔ آجکل وہ کرنل اشتیاق کے گھر آنے جانے لگا تھا۔ نائلہ کو لفٹ دے رہا تھا۔

"نہیں بیٹھوں گی۔" اُس نے اس کا ہاتھ زور سے جھٹکا۔

...

"دیکھو تمہارا ہی ہاتھ دکھے گا۔ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔"

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"تمہیں ہو کیا گیا ہے؟"

"کچھ بھی ہوا ہے۔ آپ کو کیا؟"

اور اس کا ماتھا ٹھنکا۔ ضرور کچھ گڑبڑ تھی۔

"شہزادہ آیا تھا پرسوں دن؟"

"نہیں"۔ اس نے مزاحمت چھوڑ دی تھی۔ مگر لہجہ اب بھی ذرا سا خفا خفا۔

"خیر، تم باہر نہیں نکلیں۔ میں دو دن متواتر وہاں گیا تھا۔"

"مجھے بخار ہو گیا تھا۔"

"اوہ، کب؟"

"جب آپ کرنل کے گھر چائے پر گئے تھے۔" وہ اپنا طنزیہ لہجہ چھپا نہ سکی۔

"اوہ"۔ وہ بہت کچھ سمجھ گیا۔

جانے کیوں؟ اُسے بڑا مزہ آیا۔

"تمہیں کس نے بتایا؟"

"ایسی باتیں چھپتی نہیں ہیں۔"

"بڑی عقلمند ہوتی جا رہی ہو"۔ وہ شرارت سے آنکھیں جھپکاتے ہوئے بولا۔

"میرا ہاتھ چھوڑ دیں"۔ اس نے پھر ہاتھ کھینچا۔ لہجے میں تیزی سی آ گئی تھی۔

"نہیں چھوڑوں گا۔"

"آپ بیک وقت کتنی لڑکیوں کو دھوکہ دیتے ہیں؟"

"تمہیں اچھا نہیں لگتا جب ایسا کرتا ہوں تو؟"۔

"مجھے کیا آپ کچھ بھی کریں" وہ مزید تیزی سے بولی۔

اور وہ مزید کھلکھلا دیا۔

"اچھا چھوڑو یہ بات۔ یہ بتاؤ تمہارے آفس کا خط آیا ہے۔ تیمور؟"

"روز آتا ہے"۔ وہ بھی شاید اُسے جلانے کا سوچ رہی تھی۔

"بڑا پیار کرتا ہے تم سے"

"شاید"۔

"تمہیں اچھا لگتا ہے وہ؟"

"آپ کیوں پوچھتے ہیں؟"۔ وہ تلخی سے بولی۔

"میں تمہیں اتنا ڈھیر سا پیار کرتا ہوں۔ اتنا حق تو مجھے پہنچتا ہے نا کہ یہ بات پوچھوں تم سے"۔

"آپ پیار کرتے ہیں؟"

"اور کیا جھک مارتا ہوں"

"اور وہاں کیا کیے تھے میں جا کر؟"۔

"کہاں؟"۔ وہ انجان بن گیا۔

"یہی باتیں آجکل وہاں بھی دہراتے ہوں گے"

"نہیں میڈم۔ بالکل نہیں۔ یہ باتیں تم سے۔ اور صرف تم سے ہوتی ہیں"۔ وہ اُسکی انگلیوں میں اپنی انگلیاں پھنساتے ہوئے مخصوص انداز میں ہنستے ہوئے بولا۔

وہ خاموش ہوگئی۔

"اچھا میں آگئی۔ وہاں نہیں جاؤں گا۔ اب تو خوش؟"

وہ اب بھی نظریں جھکائے میز پر رکھے TIME کے پرچے کو تکتی رہی۔

"تمہیں یہ کیا کس نے ہے۔؟" وہ پھر بولا۔

"سب بتا دیا کس نے"۔

"اور تم ناراض ہو گئیں؟"

"میں کیوں ناراض ہوں گی۔؟"

"یہ اپنے دل سے پوچھو"۔ وہ آرام سے بولا۔

اور اس کی پلکیں گرنے اور اُٹھنے لگیں۔

"اچھا . . . . بس . . ."

"چلو چھوڑو۔ کچھ اپنے اسکول کے متعلق بتاؤ"۔

"آپ کو اسکول سے اتنی دلچسپی کیوں ہے؟"

"مجھے؟ اسکول سے دلچسپی ہے؟"۔

"پھر کیوں پوچھتے رہتے ہیں؟"۔

"بس یوں ہی۔ اندازہ کرنا چاہتا ہوں کہ وہ خوش قسمت تمہیں کتنا اچھا لگتا ہے جو مجھے اچھا نہیں لگتا"۔

"کیوں؟"

"بس؟"

"پھر منگنی کیوں کی تھی؟"

"بابا جان کی خواہش تھی"۔

"اور خود تمہاری مرضی؟ تم تو ہو ہی اتنی سی۔

مائیکروسکوپک سی چیز۔ بابا جان نے اہمیت ہی نہیں دی ہوگی"

اور اسکے لب و لہجے پر اُسے ہنسی آگئی۔

" It LETS STOP. آؤ اپنی باتیں کرتے ہیں۔ بلکہ تم تو کیا اپنی

باتیں بتاؤ گی۔ میں اپنی سناتا ہوں۔

رات میں نے خواب دیکھا تھا۔۔۔" وہ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

اور وہ مسکراتے ہوئے اس دلچسپ آدمی کو دیکھنے لگی۔

"خواب میں ایک لڑکی دیکھی تھی۔ بے حد خوبصورت۔ نازک نازک سی"

اور شائی کے ماتھے پر شکن ابھر آئی۔

"اب تم خواب میں آئی لڑکی پر ناراض ہونے لگیں"۔

"میں کیوں ناراض ہونے لگی"۔ وہ تُنتُنا کے بولی۔

"اچھا سنو۔ پھر وہ میرے قریب آئی۔ بہت زیادہ۔ تھی بھی بہت

پیاری" وہ چبا چبا کر کہہ رہا تھا "سو میں نے اُسے سینے سے لگا لیا"

"آپ تو ہیں ہی بدمعاش" خفگی سے کہتے ہوئے اُس نے اپنا ہاتھ ایک

جھٹکے سے چھڑا لیا۔

اور کامران زور زور سے قہقہے لگانے لگا۔

اُسے بھی ہنسی آنے لگی۔ ہانفہ بڑھا کر اس نے میز پر سے میگزین اٹھا لیا۔

"یہ میرا ہے" کامران نے جھپٹ سے چھین لیا۔ رسالے کر پھر اس نے لوٹا

کوشش میں نبیلہ کے ۔ احسن کے سامنے ہی آنسو گرانے پر مجبور ہو جاتی ۔

"چھوڑ دیں مجھے" بھرائی ہوئی آواز میں کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی ۔ کرسی پیچھے کھسکائی ۔ اور جانے کے لئے قدم بڑھا دیئے ۔

"پلیز ..." وہ احسن کے سامنے کھڑا ہوا ۔

"پلیز ..." احسن نے دوبارہ کہا ۔ اور پیار کے تمام تر جذبوں کے ساتھ اُسے سینے سے لپٹا لیا ۔

"شانی! کیوں دور دور رہتی ہو ۔ میں پاگل ہو جاؤں گا ۔ مجھے اور مت آزماؤ ..." ۔ اُس کی آنکھوں پر بے تحاشا پیار کرتے ہوئے وہ کہتا گیا ۔

وہ ۔ اُس کے سینے سے لگی بے بسی سے روتی رہی ۔

"شانی! میں اچھا نہیں لگتا؟" اس کی روتی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے احسن نے پوچھا ۔

اس کے سینے سے سر ٹکائے جیسے وہ مزید رو دی ۔

"نہیں وہ، مجھ سے زیادہ اچھا لگتا ہے؟"

"مجھے ... وہ اچھا نہیں لگتا" ۔ وہ روتے ہوئے بولی ۔

"پھر کون اچھا لگتا ہے؟" ۔ وہ مسکراتی آنکھوں سے اس کی روتی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا ۔

"نہیں معلوم ..." ۔ اس کی نظریں لڑکھڑا کر جھک گئیں ۔

اور کامران خوبصورتی سے ہنس دیا ۔ کسی طرح اقرار کر ہی بیٹھی تھی ۔ اس کے

پیار کا ۔

"بتاؤ نا کون اچھا لگتا ہے؟" انداز خود سپردگی لیے اس کے سینے سے لپٹی تھی ۔ مگر ۔ اقرار بھی نہیں کر رہی تھی ۔

"کوئی بھی نہیں" ۔ وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی ۔

"کوئی تو ہے" ۔ وہ شرارت سے بولا ۔

"نہیں ہے" ۔ وہ پھر بولی ۔

"اوہ ۔ خود تو ہو پاگل ۔ مجھے بھی کروا کے چھوڑو گی" ۔ وہ اس کے کندھے سے تھامے باہر نکل آیا ۔

"آؤ بیٹھو" ۔ وہ کار کی طرف بڑھا ۔

"نہیں" ۔

"پھر؟" ۔

"پیدل جاؤں گی" ۔

"آؤ پلیز" ۔

"نہیں" ۔

اور وہ ایک گہری سانس لے کر رہ گیا ۔ وہ اس عرصے میں خاصی چڑچڑی ہو گئی تھی ۔ پہلے سے کمزور تھی ۔ کملائی ہوئی سی تھی ۔ اور بد مزاج بھی ۔۔۔

وہ پیدل ہی چل پڑی ۔ اور وہ جیپ کر جانے لگا ۔

"جھٹ ضدی ہو" ۔ اس کے قریب سے دھیمی رفتار سے گزرتے ہوئے اس نے کھڑکی میں سے سر باہر ڈال کر کہا ۔

اچھی ہوں "۔

اور وہ دلنشین مسکراہٹ ہونٹوں پہ لیے آگے بڑھ گیا ۔

وہ واقعی ضدی تھی ۔ وہ وہاں بھی اُسے پسند کرنے لگی تھی ۔ وہ سمجھتا تھا سب ۔ مگر ظاہر نہیں ہونے دیتی تھی ۔ اور یہاں ۔ یہاں تو کتنی بیتی دیدہ دلیرانہ خود سپردگی لیے اُس کے سینے سے لگی رہتی تھی سینے سے لگی لگی تب اپنے منگیتر سے ناپسندیدگی کا اظہار کرتی تھی ۔ اور سینے سے لگی لگی ہی ۔ جب وہ اُس سے پوچھتا ۔

"پھر کون اچھا لگتا ہے؟" ۔ وہ یکدم ہی سٹپٹا جاتی تھی ۔

وہ دھیمے سے مسکرا دیا ۔

معصوم سی گڑیا ۔ بالکل ایسی نازک سی تھی ۔ وہ بھی اسکی طرح ناداں سے کچھ نہیں سمجھتا جیسے ۔

وہ اُسے ہی تو پیار کرتی تھی ۔ اُس کے سینے سے لگ کر اپنی ریشمی سانسوں سے اس کے بے تحاشہ پیار کا اقرار کرتی تھی ۔ مگر زبان سے پھر بھی ۔ انکار کر رہی تھی ۔ اپنے سیاہ کوٹ کے بٹن میں اٹکے اُس کے سنہرے ریشمی بال کو کھینچتے ہوئے وہ دھیرے سے مسکرا دیا ۔

وہ اُسی کا تو پیار تھی ۔ اُسی کی تو تھی ۔

—

کئی دنوں سے آسمان کو گھیرے ہوئے بادل آج برس ہی پڑے تھے۔ تمام رات ننھی ننھی سی بارش ہوتی رہی تھی۔ صبح بھی بادل کھل کر پانی برستا رہا تھا۔ مگر اس وقت بوندا باندی تھم گئی تھی۔ ہر چیز دھل کر نکھر آئی تھی۔ پہاڑیوں اور درختوں پر پچھلے مہینوں کی گرد پانی سے دھل کر بہہ گئی تھی۔ مگر منجمد کر دینے والی ہوا اب بھی چل رہی تھی۔ سیاہ بادل اب بھی سر پہ چھائے نظر آ رہے تھے۔

آہستہ آہستہ گھوڑا دوڑاتا وہ ندی کے راستے گھر کی طرف چلا جا رہا تھا۔ کچھ اس امید پر کہ شاید شانی بھی اپنی حویلی کے سامنے جاگنگ کرتی یا واک کرتی نظر آ جائے۔ سردی شدید تر تھی۔ بادل ابھی اور برسنا چاہتے تھے۔ اور سامنے کے پہاڑوں پہ آج رات برف پڑنی یقینی تھی۔

سرمئی پہاڑوں کو گھیرے ہوئے سیاہ گھٹاؤں پر نظریں جمائے وہ آہستہ آہستہ چلتا جا رہا تھا۔ تبھی

وہ چونکا۔ اس کے پیچھے ہی کوئی گھوڑا دوڑاتا چلا آ رہا تھا۔ اس نے پیچھے رخ موڑا۔ اوہ۔ یہ تو مینا اشفاق تھی۔ کچھ دیر قبل وہ اسے رائیڈنگ کلب میں نظر آئی تھی۔ اس نے تب شاید اسے دیکھا ہوگا جبھی اسی وقت اسے آ لیا تھا۔

"ہیلو کامران صاحب" ۔ وہ گھوڑے کی رفتار کم کرتی اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

"جیا"۔ انس نے بھی جواب دیا۔

"کیسے ہیں آپ کامران صاحب؟" وہ خود بولی۔

"ٹھیک۔ اللہ کا فضل ہے" انس نے خوش اخلاقی سے جواب دیا۔

"بہت دنوں سے آپ ہمارے یہاں نہیں آئے" وہ شاکی لہجے میں بولی۔

"مصروفیت ہی اتنی ہوتی ہے۔۔۔۔" انس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ چاہیں تو اتنا وقت ضرور نکال سکتے ہیں" انس نے کامران کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"کرنل صاحب کیسے ہیں؟" انس نے بات کا رخ موڑنے کی خاطر کہا۔

"اچھے ہیں۔ ہر وقت آپ کی تعریف کرتے رہتے ہیں"۔

"نوازش ہے ان کی۔ ورنہ میں انس قابل کہاں؟"

"آپ کس قابل ہیں یہ مجھ سے پوچھئے۔۔۔۔"

"آپ بتائیے نہیں۔۔۔۔ دراصل۔۔ شام کو میں اپنی منگیتر کے پاس چلا جاتا ہوں۔ اس لئے وقت کم ہی ملتا ہے کہیں آنے جانے کا" انس نے بتا دینا ضروری سمجھا۔

"آپ کی منگیتر؟ آپ کی منگنی ہو گئی ہے کیا؟" انس نے بمشکل پوچھا۔

"جی میری منگنی ہو چکی ہے۔ ابھی ابھی کوئی ڈیڑھ ماہ ہوا ہے"

"آپ کی منگیتر یہاں ہوتی ہیں؟" انس نے مزید پوچھا۔

"جی۔ وہ سامنے بائیں جانب حویلی ہے۔۔۔۔۔"

"وہ تو شفیع احمد صاحب کی ہے۔۔۔"

"انہی کی بیٹی سے میری منگنی ہوئی ہے" وہ اطمینان سے بولا۔

"شائستہ سے؟"

"ہوں۔۔۔" وہ مسرور سا بولا۔

"لیکن آپ فرنٹیئر سائیڈ کے ہیں۔ یہاں اتنی دور۔۔۔۔"

"دل قریب ہونے چاہئیں۔ فاصلوں سے کیا ہوتا ہے۔۔۔"

"سادہ"۔ وہ جل ہی تو گئی۔

"منگنی آپ کی پسند پر ہوئی ہے؟"

"جی۔ میں نے اسے دیکھا۔ مجھے اچھی لگی۔ امی سے ذکر کیا۔
انہوں نے ڈیڈ سے۔ وہ فوراً مان گئے۔ کسی زمانے میں ڈیڈ یہاں ایجنسی میں رہ چکے تھے۔ وہ انکل نصیر احمد کو جانتے تھے اچھی طرح۔ پھر مہینہ بھر کے سوچ
بچار کے بعد انکل نے بھی ہاں کر دی۔ اور امی اور خالہ نے آکر اسے انگوٹھی پہنا دی
اس طرح سے ہم دونوں کی منگنی ہو گئی۔۔۔" اس کے بار بار کے سوالوں پر اس
نے مختصراً اسے ساری بات بتا دی۔

تبھی خیابان کے نیچے سے نکل کر سامنے آتے ہوئے اس نے دیکھا۔ کچھ فاصلے پر
شانی اپنی حویلی کے سامنے حسب سابق سٹینڈ لگائے تصویر بنانے میں مصروف تھی۔

"آج خیریت نہیں" اس نے سوچا۔ اور
آہستہ سے گھوڑے کو پانی میں ڈال دیا۔

"آپ نے اچانک رخ کیوں بدل لیا؟" کامران کی تقلید میں نائلہ نے بھی
گھوڑے کا رخ موڑ لیا۔

"مجھے جلدی ہے۔ یہ کنارا نسبتاً نزدیک پڑتا ہے" اس نے بات بنائی۔

اُس کی ہمراہی میں وہ شانی کے اتنے قریب سے نہ گزرتا ۔مگر ۔اس کے باوجود ۔ روم میٹ کو شانی رکی ۔تو کھینچ دیکھتے ہوئے نالے کے دوسرے کنارے پران دونوں کو گھوڑوں پر سوار آہستہ آہستہ ٹہلتے دیکھا پھر اس کے جو انس جیسے کام کرنا ہی بھول گئے ۔ایک ٹک وہ دونوں کو جاتے دیکھتی رہی ۔

تو دونوں اکٹھے رائیڈنگ کرنے نکلے تھے ؟ ۔اب شاید اسے گھر بھی لیکر جا رہا تھا ۔ وہ پاگل سی ہو اٹھی ۔ اسے کچھ ہی نہ آئی ۔وہ کیا کرے؟ چیزیں دہیں چھوڑ چھاڑ وہ سیڑھیاں چڑھ کر لان میں پڑی کرسی پر ڈھیر ہو گئی ۔کیسی تھی اس کی قسمت؟ کچھ عرصے سے مسلسل دکھ اور درد دیتی آ رہی تھی ۔ایسا دکھ اور ایسا درد ۔کہ کسی سے کہہ بھی نہ سکتی تھی ۔

کرسی کی پشت سے سر ٹیک کر وہ بے بسی سے رو پڑی جب ان دونوں کا آپس میں کوئی رشتہ ہی نہیں تھا ۔تو پھر وہ اسے نائیلہ کے ساتھ دیکھ کر کیوں اتنی بے چین ہوتی تھی؟ ۔دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی ۔ اپنی بے بسی پہ ۔ اپنی بے کسی پہ ۔

"تمہارا فون ہے شانی بیٹی" ۔ ماما نے اندر سے آواز دی ۔

"اچھا" ۔

اچھا تھا ماما قریب نہیں آئیں ۔

ورنہ وہ تو بری طرح رو رہی تھی ۔لڑکھڑاتے قدموں سے چلتی وہ اوپر اپنے بیڈ روم میں آ گئی ۔

"شانی بول رہی ہوں" ۔ اس کی آواز سے صاف پتہ چلتا تھا ۔کہ وہ رو رہی تھی

"کیا کر رہی تھیں۔؟" ۔ وہ بلا تمہید بولا۔

"کچھ بھی کر رہی تھی آپ کون ہوتے ہیں پوچھنے والے"۔ وہ اپنا غصہ چھپا نہ سکی۔

"مار سے گئے"۔ ماؤتھ پیس پہ ہاتھ رکھتے ہوئے وہ اپنے قریب بیٹھے ابھی ابھی پہنچے نعیم سے بولا۔

"میں ۔ ۔ ۔ میں تمہارا ۔ ۔ ۔ ۔"

"شٹ اپ"۔ وہ مزید دل کی برداشت نہ کر سکی۔

"تم نے شاید مجھے نائیلہ اشفاق کے ساتھ دیکھ لیا ہے ۔ ۔ ۔"

"اوہ میں کہتی ہوں بند کر دیں آپ"۔ اس کی آواز بھر بھرا گئی۔

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے ثنائی ۔ ۔"

"آپ صفائی کیوں دے رہے ہیں؟" ۔ وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

"اس لئے کہ مجھے تم سے پیار ہے ۔ ۔ ۔"

"اوہ ۔ ۔ ۔ ۔"

"پلیز ثنائی ناراض مت ہونا۔ ورنہ ۔ ۔ ۔ میں مر جاؤں گا"۔

"اللہ کرے آپ مر جائیں ۔ یا پھر ۔ ۔ میں ہی مر جاؤں"۔ اس نے روتے ہوئے ریسیور کریڈل پہ ڈال دیا۔

"چلو چھٹی ہوئی"۔ وہ ٹیلیفون بند کرتے ہوئے قالین پہ لکڑیوں کی آگ کے سامنے پڑے نرم نرم گدے پہ نعیم کے پاس آکر آتی مارتے ہوئے بیٹھ گیا۔

"یار منگنی کے بعد بے حیا جنت ہوگئے ہو"۔ نعیم ایک بڑی سی لکڑی آگ میں جھونکتے ہوئے بولا۔

ذاتی ہے۔ مجھ سے باتیں بھی خوب کرتی ہے۔ ہر بات بتاتی ہے جیسے مجھ پر مکمل اعتماد ہو۔
کرنل اشفاق کی بیٹی کا طعنہ بھی دیتی ہے۔ اور مزہ یہ ہے کہ۔۔۔۔"

اسے اچانک یاد آیا۔ وہ انس کے سینے سے لپٹی روتی بھی رہتی ہے۔ مگر پھر
چپ کر گیا۔ ہر بات بتانے کی تھوڑی ہوتی ہے؟

"کچھ چھپانے لگے ہو۔" نعیم اچانک بولا۔

"نہیں۔ سنو۔ مزہ یہ ہے کہ۔ پھر مکرتی بھی ہے۔
میں لاکھ کوشش کرتا ہوں۔ منہ سے اقرار نہیں کرتی"۔

"تم کیوں ضرور چاہتے ہو کہ وہ منہ سے بھی کہہ دے" نعیم اسے اچنبھے سے تکنے لگا۔

"بس دل کرتا ہے کہ وہ اپنے منہ سے کہہ دے۔ آخر میں بھی تو اسے کہتا ہوں کہ
مجھے انس سے پیار ہے۔ بلکہ۔۔۔۔"

"جُنت کچھ کرتے ہو گئے ہو۔ مجھ سے چھپا رہے ہو۔"

اور کامران نے زور سے قہقہہ لگا لیا۔

"مجھے کیا بدمعاش سمجھ لیا ہے؟" وہ اب بھی ہنس رہا تھا۔ "بوفر تو بولا"۔

"ہاں" انس نے ہنستے ہوئے اقرار کیا۔

اور نعیم نے گہری سانس لی۔

"Will Power بڑی چاہیے۔"

اور کامران کے فلک شگاف قہقہے بلند ہو گئے۔

"ویسے کل میری خیر نہیں ہے۔"

"کیوں؟"

"اس نے مجھے رنگے ہاتھوں نائیلہ اشفاق کے ساتھ ڈیٹنگ کرتے دیکھ لیا ہے"۔

"اسے پتہ ہی نہیں کہ تم اس کے منگیتر ہو اور ڈرتے ہو اسی سے"۔

"منگیتر تو بقول اس کے اس کا بھی کوئی اور ہے۔ میں نہیں۔ پھر اسے کیوں جلتی ہے۔ مجھے کسی اور لڑکی کے ساتھ دیکھ کر؟"۔

"بھئی مجھے تو کچھ نا کہو۔ تم دونوں کا رشتہ خاصا پیچیدہ اور باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں"۔ وہ ہاتھ اونچا کر کے کال بیل پہ انگلی رکھتے ہوئے بولا۔

کامران نے اسے پھر منا لیا تھا۔ منت سماجت کر کے۔ ہاتھ جوڑ کر۔ اور آخر میں بے تحاشہ پیار کر کے وہ اس کی توقع کے مطابق اس بار بہت ناراض تھی مگر اس نے جب بھی اس سے ناراضگی کی وجہ پوچھی۔ اس سے کوئی جواب ہی نہ بن پڑتا۔ نظریں چراتے ہوئے چپ کر جاتی۔ جب بھی اس نے براہ راست نائیلہ کا نام لیا۔ کہ وہ اس کی وجہ سے ناراض ہے۔ وہ کاٹ کھانے کو دوڑتی۔ مگر

اس کے باوجود وہ اسی وجہ سے روٹھی ہوئی تھی۔

جب اس نے قسمیں اٹھائیں۔ ہاتھ جوڑے۔ وعدہ کیا کہ وہ کبھی اس سے نہیں ملے گا۔ تو اس کی خوبصورت آنکھیں جھک اٹھی تھیں۔ اور یہ کشش

ہونٹوں پہ اطمینان کی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

انس نے انس سے اس کے منگیتر کا حال بھی پوچھا تھا۔ جبکہ وہ اس بارے میں سننے کو بھی تیار نہ تھی۔

"نہیں وہ اچھا نہیں لگتا کیا؟"۔ انس نے اسے سینے سے لپٹائے لپٹائے دھیرے سے پوچھا تھا۔

"نہیں"۔ انس نے صاف کہا تھا۔

"پھر؟ کون اچھا لگتا ہے؟"۔ انس نے غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر پوچھا تھا۔

"کوئی بھی نہیں"۔ انس کی نظریں پھر لڑکھڑا گئی تھیں۔

مگر وہ جھنجھلا اٹھا تھا۔

"تم چھپاتی کیوں ہو؟"۔ وہ اچانک بازوؤں کا حصار توڑ کر اس کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے سختی سے بولا تھا۔

"میں۔ میں کیا چھپاتی ہوں؟"۔ وہ اس کے ردعمل پر بوکھلا سی گئی۔

"تم اپنی منگنی سے خوش کیوں نہیں ہو؟"

"میری مرضی"۔ وہ نظریں جھکاتے ہوئے بولی۔

"تم پھر چھپا رہی ہو۔ تمہاری مرضی کے پیچھے کچھ ہے"۔

"کچھ بھی تو نہیں"۔ وہ آہستہ سے اس کے ہاتھ ہٹاتے ہوئے نیچے دیکھنے لگی۔

"میں چلتا ہوں۔ تم بور کرتی ہو"۔ اس نے

باہر جانے کے لئے قدم بڑھا دیے تھے۔ کوشش کا کارہ تخفیف کر بہتر

کرتے احسن نے پھر مڑ کر دیکھا۔
ہوئے ہوئے آنسو آنکھوں میں لیے وہ نادم سی کھڑی اسے دیکھ رہی تھی وہ الٹے
قدموں واپس چلا آیا۔ ایک نظر سنجیدگی سے احسن کی آنکھوں میں دیکھا۔ اور پھر
بے اختیار اسے سینے سے لگا لیا۔

"شانی! میری زندگی۔ کہہ دو کہ تم مجھ سے پیار کرتی ہو۔ کہہ دو ورنہ میں مر جاؤں گا۔"
اسے بھینچ بھینچ کر پیار کرتے ہوئے وہ کہتا گیا۔ اور
شانی اندازِ خود سپردگی سے احسن کے سینے سے لگی اتنا روئی۔ اتنا روئی۔ کہ اگلی
پچھلی ساری کسر نکال دی۔

مگر۔ احسن کے باوجود۔ احسن کے پیار کا اقرار احسن کی زبان پر نہ آ سکا کیونکہ بابا
کردہ تو کسی اور کی پابند تھی چند ماہ اور تھے۔ اور پھر احسن نے ہمیشہ کے لیے اپنے منگیتر
کا ہو جانا تھا جس سے اسے کوئی دلچسپی تھی نہ کوئی دلی تعلق، کچھ عرصہ قبل اس سے ہمدردی
اور ترس کے جذبات ضرور تھے۔ مگر جب
سے اپنا پیار سامنے پایا تھا وہ جذبات یکسر ہی ختم ہو گئے تھے۔ اب تو وہ اس
سے وابستگی کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ بلکہ اب تو۔ اب تو وہ اس سے نفرت
کرنے لگی تھی۔ اپنا پیار جو مل گیا تھا۔

مگر
یہ کیسا پیار تھا۔ چند روزہ۔ پھر ہمیشہ کے لیے وہ احسن سے جدا ہونے والی تھی۔
وہ اچانک ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی
"شانی اتنا روتی کیوں ہو؟" کامران گھبرا سا گیا۔

اور یہ دل کھول کر رو دی۔ کافی دیر بعد آنسو پونچھتی خود بخود اس سے الگ ہو گئی۔ اور پھر چلنے کیوں؟ بغیر کچھ کہے چند قدم چل کر اپنی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

وہ حیران سا وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہا تھا۔ اس نے ایک بار بھی مڑ کر پیچھے نہیں دیکھا تھا۔ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ تو دھیرے سے سر جھٹکتا وہ اپنی راہ ہو لیا تھا۔

وہ عجیب سے دوراہے پر کھڑی تھی۔ بستر پر پڑ کر وہ مزید پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ آج تو جیسے مزید صبر کا یارا نہ رہا تھا۔ اپنے دکھ اسے لاتعداد ہی نظر آنے لگے۔ کیا ہونے والا تھا۔ اس کے ساتھ؟ اپنا منگیتر اسے ناپسند تھا۔ اس سے قربت کو وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی جس سے پیار تھا اس کے ساتھ وابستگی ناممکن تھی۔ اور اس پر نایاب اشفاق کا وجود اس کے لیے سوہانِ روح بنتا جا رہا تھا۔ اسے اپنا آپ مظلوم سا نظر آنے لگا۔

رات اس نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ ماما کے اصرار کے باوجود سر درد کا بہانہ کر کے بستر میں پڑ رہی تھی۔ تمام رات سوچ سوچ کر سر دکھنے لگا تھا۔ وقفے وقفے سے رو رو کر آنکھیں متورم ہو گئی تھیں۔

باباجان بھی اگلے ہفتے وطن پہنچنے والے تھے۔ پھر یقیناً شادی کا ذکر چھڑ جانا تھا۔ اور اس ذکر سے ہی اس کی روح فنا ہوتی تھی۔

کیا وہ باباجان کے آگے اس منگنی سے انکار کر دے؟ کیا وہ مان جائیں گے؟؟ شاید۔ مان جائیں۔ وہ اسے بے تحاشا چاہتے تھے۔ اس کی خواہش کبھی رد نہیں کرتے تھے۔ مگر۔ کیا وہ یہ نہ کہیں گے منگنی سے پہلے اس نے کیوں حامی بھری تھی؟ اس کی مرضی بھی پوچھی تو گئی تھی۔

تو کیا منگنی کی لاج رکھتے رکھتے وہ اپنی زندگی اور اسکی ساری خوشیاں بھینٹ
چڑھا دیگی ۔؟ کیا ساری زندگی یوں ہی دردسے سسکتے بتا دیگی؟ ۔ یوں ہی آہیں بھرتے
بھرتے سسلگتے سلگتے؟ ۔
وہ گھبرا کر بستر میں اٹھ بیٹھی ۔ کیسا بھنگا سودا تھا ۔ "نہیں" ۔ اس نے سر دونوں
ہاتھوں میں تھام لیا ۔ "وہ اتنے ڈھیر سارے دکھ نہ سہہ سکے گی ۔ وہ بابا جان سے کہہ
دیگی ۔ وہ اس منگنی پر پابند نہیں رہ سکتی ۔ وہ مان جائیں گے یقیناً ۔ انہیں اس سے
بے حد پیار تھا ۔ وہ یقیناً اس کی آئندہ زندگی دکھی اور سسکتے گزرتی برداشت نہ کر
پائیں گے ۔" یہ سوچ کر اسے ایک گونہ سکون ملا ۔
پھر صبح کی سپیدی نمودار ہوئی ۔ تو اٹھ کر ہاتھ روم گئی ۔ وضو کیا ۔ اور نماز پڑھ
کر خلوص دل سے اپنے دل اور ذہنی سکون کی دعا مانگی ۔
آج دن بھر ذہن کچھ ہلکا ہلکا سا تھا ۔ مگر رفتہ رفتہ اسے اپنا ایمان ڈانواں
ڈول ہوتا محسوس ہوتا ۔ مگر پھر بھی دل کو سمجھا بجھا کر دلیر بننے کی کوشش کرتی ۔
صبح کی بوندا باندی کے بعد مطلع صاف ہو گیا تھا ۔ سرسبز نکھری نکھری ۔ دھلی
دھلی نظر آ رہی تھی ۔ لال لال ٹیلے ستھرے ستھرے نظر آ رہے تھے ۔ اور اونچے سرمئی پہاڑوں
کی چوٹیاں برف سے ڈھکی سنہری دھوپ میں چمک رہی تھیں ۔ نالے میں پانی کی سطح اونچی
ہو گئی تھی ۔ اور سرخی مائل گدلا سا پانی اپنے مخصوص شور کے ساتھ رواں دواں تھا ۔
حویلی کے آخری حدود میں نالے کے کنارے بڑے سے پتھر پہ بیٹھی وہ جانے
کن سوچوں میں گم تھی ۔
"تو تم کون ہے ۔؟" جانی پہچانی آواز کے ساتھ ہی اسے اپنی آنکھوں پہ جھکے

جیسے ہاتھ کا مس محسوس ہوا۔

اس کا دل یکبارگی دھڑک اُٹھا۔ اور ساتھ ہی آج دن بھر کا ڈوبتا اُبھرتا ارادہ کانپ کانپ گیا۔

کوئی جواب نہ پا کر وہ دھم سے اُس کے بالکل قریب اُسی چھپر پر بیٹھ گیا۔

شانی نے دیکھا اُس کے ہاتھوں میں بڑے بڑے تازہ اور خوبصورت گلاب تھے۔

"کل تمہاری سالگرہ ہے نا"۔ وہ پھول اُسے تھماتے ہوئے بولا۔

"آپ کو کیسے معلوم ہوا؟" اُسے شدید حیرت کے ساتھ ساتھ یاد آیا۔ کل واقعی اُسکی سالگرہ تھی۔

جسے بابا جان ہر سال جب وطن میں موجود ہوتے تو ضرور مناتے تھے۔ اس بار بابا جان بھی موجود نہ تھے۔ اور خود اُسے بھی اس مرتبہ پہلی بار یاد نہ آیا تھا۔ کہ آج اسکی برتھ ڈے ہے۔

"بس معلوم ہو گیا"۔ وہ اسپیشل چاکلیٹس اور سوئیٹس کا بڑا سا پیکٹ اُس کی گود میں ڈالتے ہوئے بولا۔

وہ سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔

"کھولو۔ دونوں کھائیں گے"۔ وہ اپنائیت سے بولا۔

"بتائیں نا کیسے پتہ چلا؟" پیکٹ کا ڈھکنا کھولتے کھولتے اُس نے پھر پوچھا۔

"ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گی"۔

اور وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

"بتا دوں؟" وہ شوخی سے بولا

"بتا دیں"۔

"نائلہ اشفاق نے فون پر بتایا تھا۔" اسے واقعی کل شام انہی نے بتایا تھا۔ اور شنائی نے بلا سوچے سمجھے چاکلیٹ اور بسکٹس کا ٹن اور کشکول واپس بینچ پر رکھ دیے۔

انس کے خوبصورت چہرے پر کرب و اداسی کے آثار صاف نمایاں تھے۔

پھر جانے کیا ہوا؟ وہ بینچ پر سے اٹھ گئی۔ وہ حیران سا ہوا۔ آج وہ اپنی جیلسی چھپا نہیں رہی تھی۔

"کہاں؟" انس نے جھٹ سے اسے ہاتھ سے پکڑ کر واپس بٹھا لیا۔

"چھوڑ دیں مجھے"۔ وہ ہاتھ چھڑاتے ہوئے غصے سے بولی۔

مگر انس نے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنا بازو اس کی کمر میں ڈال کر اسے مزید اپنے قریب کر لیا۔

"نہیں چھوڑوں گا"۔

"آپ یہ سب انس کے ساتھ کیا کریں۔"

"کیا انس کے ساتھ کروں؟" اسے ہنسی آ گئی۔

"بس جانے دیں مجھے"۔

"لیکن کیوں؟"

"بس آپ وہاں جائیں"۔

"کہاں؟"

"وہ آسی نائلہ کے پاس۔"

"تمہارے پاس کیوں نہیں؟"

"آپ کو وہ اچھی لگتی ہے نا"۔ وہ بچوں کی سی معصومیت سے بولی۔

"جلتی ہو اُس سے؟" وہ اُس کے کان میں بولا۔

"میں کیوں جلوں گی؟" وہ حسبِ سابق بولی۔

"اچھا نہیں جلتیں۔ تو یہ کھاؤ" وہ چوکلیٹ اس کے منہ میں دیتے ہوئے خوبصورتی سے ہنس دیا۔

"یہ سب اُسے دے دیں"۔ وہ شانی انداز میں بولی۔

"اُسے اور دے دوں گا۔ یہ تمہارے لئے ہے"۔

اور وہ پھر آپے سے باہر ہونے لگی۔

"چھوڑ دیں مجھے"۔ اُس کے بازو کی گرفت سے اپنی کمر چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے وہ تیزی سے بولی۔

"اچھا بابا پلیز! معاف کر دو"۔ اُس نے شرارت سے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے"۔

اُس نے فون بند کیا تھا۔ اب رنگ ہو تو یہ پتہ تو نہیں چلتا نا کہ کس کا فون ہے؟ میرے اٹھانے پر اُس نے کہا "میں نے صرف یہی کہنا تھا کہ کل اُس کی سالگرہ ہے" اُس نے ساری بات سچ سچ بتا دی۔

شانی کا پارہ واپس گرنے لگا۔

"وہ بھی ناراض ہے آجکل"۔ اُس نے پھر مشورہ دی۔

اور وہ دانتوں سے اسکا دیں کمر میں حمائل ہاتھ کاٹ کر اپنے کو چھڑاتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"باپ رے"۔ اشن نے اس کی کاٹی ہوئی جگہ پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

"بری مریض ہو بالکل"۔

"اچھی ہوں"۔

"اس میں کیا شک ہے"۔ وہ اسے اپنے ہاتھ پر اس کے ناخنوں کے نشان دکھاتے ہوئے بولا۔

وہ چپ سی ہو کر ایک قدم آگے بڑھ گئی۔

"یہ لے لو"۔ اس نے چھتری پر رکھے پھولوں اور سوئٹس کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں"۔ وہ پھولے پھولے منہ کے ساتھ بولی۔

"اگر تم نے یہ چیزیں نہ لیں۔ تو تم سے کبھی نہیں بولوں گا"۔ اس نے دو ہی قدم اٹھائے تھے، کہ وہ پیچھے سے آتا ہوا بولا۔

جانے کیوں؟ وہ وہیں ٹھٹھک کر رک گئی۔ سر جھکائے بلا مقصد بوٹ کی نوک سے گیلی ریت میں لکیریں بنانے لگی۔

"کسی کی دی ہوئی چیزیں واپس نہیں کیا کرتے"۔ اس نے اداسی سے مزید کہا۔

اور آگے بڑھ گیا۔

"آپ... آپ کہاں جا رہے ہیں؟" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

"اتنا زیادہ اشتیاق ہے یہاں۔ اس نے بلایا تھا"۔ وہ پیچھے دیکھے بغیر چہرے سے بولا۔

"اوہ"۔ اسے اپنا دل بیٹھتا سا محسوس ہوا۔ آنکھوں میں اچانک ہی بے شمار آنسو اکٹھے ہو گئے۔

وہ دو قدم مزید آگے بڑھا۔ پھر مڑ کر پیچھے دیکھا۔ اُس کے آنسو اُس کی گردن تک
گئے۔ وہ پھر پلٹ آیا۔ "اُس نے فون پر مجھے بلایا تھا، کیسی تھی وہ منٹ کی بات ہے
سن جاؤ۔"

"آپ وہاں نہیں جائیں گے، نہیں جائیں گے۔" وہ اچانک اُس کے بازوؤں
میں سماتے ہوئے اپنا سر اُس کے سینے سے بھینچتے ہوئے رو پڑی۔

"اچھا۔ اچھا۔" اُس کا سر سہلاتے ہوئے وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔ "تمہیں
وہ اچھی نہیں لگتی؟"

"نہیں۔"

"اچھا وہ اچھا لگتا ہے؟"

"نہیں۔" وہ مزید تڑپ کر رونے لگی۔ "مجھے ان لوگوں سے بچا لیں، پلیز۔"

اُسے وہ اپنا بہت قریبی ہمدرد نظر آیا۔

"پھر منگنی کیوں کی تھی؟" وہ دھیرے سے بولا۔

"وہ باباجان کی خواہش تھی۔ مجھے اُس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ مجھے بچا لیں پلیز،
پلیز۔۔۔" اُس کا رو رو کر بُرا حال ہو رہا تھا۔

"رو مت، نہیں پلیز۔۔۔" اُس نے اپنی انگلیوں سے اُس کے آنسو خشک کیے۔
"مسکرا دو۔"

اور نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے مسکرانا پڑا۔ وہ بھی خوبصورتی سے ہنس دیا۔

"نابیلہ بُری لگتی ہے۔ اپنا منگیتر بُرا لگتا ہے۔ میں بُرا لگتا ہوں۔ پھر اچھا کون
لگتا ہے؟" وہ اُس کی روتی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

اور شانی کوئی جواب دیئے بنا سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔

"بتاؤ نا" ۔ اس نے اصرار کیا۔

مگر اب کے اس کے ہونٹوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ اور اس نے سر واپس اس کے سینے سے ٹکا لیا۔

اس ادا کے انداز اقرار پہ کامران نے اسے مزید بھینچ لیا۔ بے تحاشہ پیار کر لیا۔ شام کے سائے غالب آ رہے تھے۔ سامنے بلندی پہ اس کے رنگ برنگ میں جیسے جگنو ٹمٹمانے لگے تھے۔

"میں اچھا لگتا ہوں نا؟" ۔ اس کا چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے اس نے دھیرے سے پوچھا۔

"مجھے سردی لگ رہی ہے۔" اس نے مسکرا کر بات ٹالنا چاہی۔

"ٹھہرو ذرا پاگل ہو"۔ اپنا کوٹ اتارتے ہوئے اس نے اس کے کندھوں پہ ڈال دیا۔

"اب بتاؤ" کامران کی نظریں اب بھی اس کے چہرے پہ جمی تھیں۔

"سردی لگ رہی ہے"۔ اس نے ٹھیر کیا۔

"ہوں" ۔ اس نے گہری سانس لی۔ پھر اپنی سرخ رنگ کی جرسی بھی اتار دی۔

کوٹ اس کے کندھوں سے ہٹا لیا۔ اور اس کے نرم نرم گلابی سویٹر پہ اپنا بڑا سا سویٹر اسے پہنا دیا۔ پھر کوٹ دوبارہ اس کے کندھوں پہ ڈال دیا۔

"دو بجے"۔

"اب بھی لگ رہی ہے"۔ وہ شرارت سے بولی۔

"یہ لو"۔ وہ اپنی قمیض کے گلے کے بٹن کھولنے لگا۔

"نہیں"۔ وہ پہلی بار کھلکھلا کر ہنس دی۔

"کیوں؟ سردی ختم؟" وہ گلے کے بٹن یوں ہی کھلے چھوڑتے ہوئے بولا۔

"ہاں"۔ وہ پھر ہنس دی۔

"بتاؤ پھر"۔

"آپ کو سردی لگ رہی ہوگی"۔ اسے پھر بات بنانا پڑی۔

"اوہ۔ اندازے سے زیادہ ہوشیار ہو"۔ اس نے جھلاتے ہوئے اسے سینے سے بھینچ لیا۔

اور پھر۔ اسے پیار کر لیا۔ آنا کا۔ اس پورے عرصے میں جس کر رہا تھا۔

پھر گلاب اور سوغلیں اسے تھمائے۔ اور کندھوں سے سہارا دیتے ہوئے حویلی کی سیڑھیوں تک لے آیا۔

"آپ یہ لے لیں"۔ وہ اپنے کندھوں سے اس کا کوٹ اتار کر اسے دینے لگی۔

کامران نے کوٹ اس کے ہاتھوں سے لے کر پہن لیا۔

"یہ بھی"۔ وہ اس کا سویٹر بھی اتارنے لگی۔

"نہیں جیم"۔ یہ تمہارے پاس رہنے دو۔ آسمان بتا رہا ہے۔ رات برف ضرور پڑے گی۔ یقیناً تمہیں سردی زیادہ لگے گی"۔ وہ خوش دلی سے کہہ گیا۔

اور وہ خوبصورتی سے ہنس دی۔

"خدا حافظ"۔ اس نے اس کا رخ لستہ ہاتھ ہونٹوں سے دبایا۔

"خدا حافظ"، وہ دھیرے سے بولی۔
اور وہ اسے سیڑھیاں چڑھتے نظروں سے اوجھل ہونے تک دیکھتا رہا۔

آج صبح سے سارا دن برف گرتی رہی تھی۔ وہ کھڑکی کے پاس آرام چیئر پہ بیٹھی
آسمان سے روئی کے گالوں کی طرح گرتی برف کو تکتی رہی تھی۔
آج صبح سے وہ بہت کھوئی کھوئی ہوئی تھی۔ نجی اپنے پیار کے اظہار اور خوشی سے
انکار کے اندھیروں میں مصروف کسی حتمی فیصلے پر پہنچا جاتا تھا۔
موسم کی طرح وہ بھی گم صم، اداس اداس تھی۔ کھانا بھی اس نے برائے نام
ہی کھایا۔ اور پھر کمبل میں گھس کر جانے وہ رات کی کس ساعت تک یونہی بیٹھی رہی تھی۔
نجانے کب آنکھ لگ گئی۔
آج شام تو چھ بجے تھے۔ آج میجر اعظم کے یہاں ڈنر تھا۔ جنرل کوارٹر سے
ڈی۔ آئی۔ جی صاحب اپنی بیگم کے تشریف لائے تھے اور کرنل اشفاق کے بعد آج
میجر اعظم نے انہیں گھر پر انوائٹ کیا ہوا تھا۔ علاقے کے چند لوگ بھی بلائے
گئے تھے۔
وہ بھی انوائٹڈ تھی۔ مگر کچھ تو پہلے ہی اس کی طبیعت اچاٹ سی تھی۔ کچھ
موسم بھی ایسا تھا۔ گو برف گرنی بند ہو گئی تھی۔ مگر پھر بھی اسے جانا ہی پڑا۔
میجر اعظم نے ٹھیک وقت پر فون کر کے اسے یاد دہانی کرائی تھی۔ وہ با دل

بخواست تیار ہونے لگی۔

نیوی بلیو گرم قیمتی لباس پہنا۔ سفید فر کا کوٹ اور ہمرنگ خوبصورت ٹوپی پہنی۔ سفید موزے اور نیوی بلیو سمارٹ سے شوز پہنے۔ لباس پر لیڈی کلون کی اسپرے کی اور نیچے اتر کر لاؤنج میں آ گئی۔ کار میں بیٹھ کر اس نے ٹائم دیکھا مقررہ وقت سے کچھ اوپر ہو گیا تھا۔ ڈرائیور نے گاڑی بڑھا دی۔ برف کی وجہ سے آگے بڑھنا خاصا مشکل ہو رہا تھا۔ بہر حال پہنچتے پہنچتے کچھ اور بھی دیر ہو گئی۔

وہ خاصی شان سے اندر داخل ہوئی۔ سب کی توصیفی نظروں سے بچتی وہ ایک خالی صوفے کی طرف بڑھی۔ کمرے میں جلتی لکڑیوں کی خوشگوار گرمی پھیل رہی تھی۔

انس نے ایک سرسری نظر مہمانوں پر ڈالی۔ عورتیں خاص طور پر لباس کے ساتھ ساتھ باتوں میں بھی ایک دوسری پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

انس نے دیکھا اس کے بالکل سامنے فوم کے نیم صوفے پر وہ بھی بیٹھا سوپ پینے میں مصروف تھا۔ پھر وہ چونکی اس کے دائیں طرف صوفے پر نائلہ اشفاق بیٹھی تھی۔

وہ پھر سے بے چین ہونے لگی۔

نائلہ اشفاق نے کچھ کہا تھا شاید۔ سوپ پیتے پیتے وہ اس کی بات پر زیر لب مسکرا رہا تھا۔ پھر اس نے خالی کپ قریب کی چھوٹی میز پر رکھ دیا۔ اور جیسے تھکے ہوئے صوفے کی پشت سے سر ٹکا دیا۔ انس نے شاید شانی کو نہیں دیکھا تھا۔ نہ ہی نائلہ نے توجہ دی تھی۔ وہ تو اس کی قربت میں مست تھی۔

بات کرتے کرتے نائلہ نے اس کے صوفے کے بازو پر رکھے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ اور جھک کر ہنستے ہوئے اس کے چہرے کو دیکھنے لگی۔

کامران نے وہیں صوفے کی پشت سے سر ٹکائے مسکراتے ہوئے اُس کی بات کا جواب دیا۔ اور شانی نے دیکھا۔ اُس نے اپنا ہاتھ نائیلہ کے ہاتھ کے نیچے سے نکالنے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔

وہ پاگل سی ہو اٹھی۔ اُس کے سامنے کتنی قسمیں اُٹھاتا تھا۔ ہاتھ جوڑتا تھا۔ معافیاں مانگتا تھا۔ اور یہاں۔ اِس وقت بھیر؟

بیگم اعظم نے سب کو کھانے کے لئے میز پر آنے کو کہا تو اُس نے دیکھا نائلہ ہی نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اُٹھایا۔ اُس کا ذہن سلگ اٹھا۔ تھکے تھکے سے قدموں کے ساتھ وہ بھی میز تک گئی۔

"ہیلو میری جان"۔ وہ پلیٹ میں چاول نکال ہی رہی تھی کہ اُس نے بالکل اُس کے کان میں آکر سرگوشی کی۔

چونک کر وہ اُس کی طرف مڑی۔ اور پھر کئی لمحے اُس کے خوبصورت چہرے پر گڑے رہ گئے۔

"خیریت ہے؟" اُس کے قریب کھڑے ہو کر اپنی پلیٹ سے کھاتے ہوئے اُس نے پوچھا۔ اُس کے تیور دیکھ کر ہی وہ سمجھ گیا تھا۔ ضرور کچھ دیر قبل اُس نے اُسے نائیلہ اشفاق کے ساتھ دیکھا تھا۔

چنگاریاں اُگلتی نظروں سے شانی نے اُسے دیکھا اور بس۔

"مجھ سے کوئی قصور ہوا ہے؟"۔ وہ واقعی شرمندہ تھا۔

نائیلہ خود ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر اُس کے قریب آ بیٹھی تھی۔ باتوں پہ باتیں کئے جا رہی تھی۔ پھر اتنے سارے لوگ تھے وہاں۔ وہ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ ہونٹ

"ہاں میں تب بہت زیادہ اپ سیٹ تھا۔"

شانی اب بھی خاموش رہی۔

"پلیز کچھ بولو نا۔"

"بولنے کو رہ ہی کیا ہے نا۔"

"پلیز شانی! مجھے سمجھنے کی کوشش کرو..."

اور شانی نے لائن ہی کاٹ دی۔ یہ کوئی پہلی بار تو نہ تھی۔ بار بار ایسا ہو رہا تھا۔ نہ کوئی جواب۔ جیسے شانی اپنی جگہ سے ہٹ کر وہاں سے دوسرے سرے پر جا پہنچی تھی۔ پھر وہ اسی پر کار میں بیٹھی، گم سی رہی تھی۔ کہ اس نے دیکھا۔ نائمہ کار میں بیٹھے کامران کو اپنے گھر پہنچانے کے لئے کہہ رہی تھی... آگے پتہ نہیں تھی۔ یقیناً کامران نے اسے سمجھایا ہوگا۔ اخلاقی فرض جو تھا۔

گھر پہنچی تو اس کے ذہن پر بہت بوجھ تھا۔ پچھلی ملاقات میں اس نے اپنا پیار بھی ظاہر کر دیا تھا۔ اپنے منگیتر سے بچھڑنے کی التجا بھی کی تھی۔ اسے شرمندگی کا احساس ہوا۔

پھر اسے یاد آیا۔ اگلے دن صبح ہی صبح وہ ابھی بستر میں تھی کہ اس نے فون کر کے اسے اس کی برتھ ڈے کی مبارکباد دی تھی۔ وہ بھی وزنگ اس کی فلسفیانہ باتوں میں کھو گئی۔ اس سے الجھتی رہی تھی۔ نائلہ کا ذکر بھی ہوا تھا۔ اس نے بالخصوص اسے نائلہ سے ملنے سے روکا تھا۔ یعنی اپنا حق جتا کر جیسے۔ پھر شام ٹھیک بارہ بجے اس کا ڈرائیور اس کا دیا ہوا بڑا سا بہت عمدہ کیک اس کے لئے لایا تھا۔ اور پھر پہلی بار خود سے فون کر کے اس نے اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔ کیوں ہوا تھا یہ سب؟ کیوں؟

بار بار اس کے دھوکے میں آجاتی تھی؟

وہ بے طرح پشیمان ہوتی جھنجلائی۔ اور آخر میں جب فارغ ہو بیٹھی۔

آج اس نے ڈیڑھ ہفتہ بعد ڈھیر سارے خط لکھے تھے۔ کئی دوستوں کے خطوں کے

جواب دینے تھے۔ چار خط کامران کے بھی آئے پڑے تھے۔ "ایسے نرالے آدمی کی خیر

بخشو بی۔" اس نے جھنجلا کر پین اٹھایا۔ اور اسے بھی جواب لکھ دیا۔

"میں اس منگنی پر پابند نہ رہ سکوں گی۔ مجھے افسوس ہے۔" اس نے اسے لکھا۔

خط لفافے میں بند کیا۔ ایڈریس لکھا۔ اور لفافہ الگ رکھ دیا۔ باقی کے سارے

خط ڈرائیور کو پوسٹ کرنے کو دیدیے۔

وہ نیچے اتر کر لان میں نکل آئی۔ کیا پہاڑ۔ کیا زمین۔ سبھی برف سے ڈھکے ہوئے

تھے۔ عمارتیں۔ ٹیلے۔ خودرو جھاڑیاں سبھی سفید برف میں ملبوس تھے۔ نیلگوں آسمان

صاف شفاف تھا۔ سنہری دھوپ برستی برف پر منعکس ہو کر نظروں کو خیرہ کیے

دے رہی تھی۔ نالے کے رخ پر لان کے اونچے کنارے پر دھیرے دھیرے چلتی

وہ کامران کو خط میں لکھے اپنے فیصلے پر سوچتی رہی۔ "ٹھیک ہی کیا ہے۔" اس نے سوچا

"یہاں کیا کم آزمائشوں میں گھری تھی کہ وہ بھی وبال جان بنا ہوا تھا۔ ایک

مصیبت سے تو جان چھوٹے۔ ایک طرف سے تو سکون ملے۔۔۔"

وہ واپس اپنے کمرے میں آئی۔ کوٹ بدلا۔ لونگ شوز پہنے۔ ہاتھوں میں گلوز

پہنے۔ گرم ٹوپی اچھی طرح کانوں کے گرد لپیٹ کر لفافہ اٹھایا۔ اور سیڑھیاں اتر کر

نیچے آگئی۔

ماما شاید کچن سائیڈ پر تھیں۔ اس نے ہال سے ماما کو اس کے باہر جانے کا بتانے کا

کہا۔ اور پہ تلے قدم رکھتی گیٹ سے باہر نکل آئی۔ برف سے اَٹی کچی سڑک پر بمشکل قدم رکھتی وہ آگے بڑھنے لگی۔ ڈاکخانہ بالکل قریب ہی تھا۔ سچ سے جیسے جیسے طبیعت بد ہو رہی تھی۔ سوچا۔ اک بھی ہو جائے گی۔ خط بھی ڈال آئے گی

اب وہ لیٹر بکس کے قریب پہنچ گئی تھی۔ اونچائی پر تھا یا وہ لیٹر بکس تک پہنچنے کے لئے اس نے خط کوٹ کی جیب میں ڈالا۔ اور دونوں ہاتھ اوپر برف میں بمشکل جمائے ہوئے جسم کو سنبھالا۔ پھر وہ اوپر چڑھ آئی۔ ہاتھ جھاڑے۔ لفافہ جیب سے نکالا۔ "کوئی خاص خط ہے جس کے لئے اتنی تردد کی ضرورت پڑی۔" اس کا لفافہ تھا۔ قہقہے لگاتے ہوئے وہ ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولا۔

وہ بھی پیچھے پیچھے ہی چلا آ رہا تھا۔ اس نے دور سے اسے سڑک پر چلتے دیکھا تھا پھر اس نے کار کی رفتار دھیمی کر لی تھی۔ اور جب وہ لیٹر بکس کے قریب پہنچ گئی۔ تو وہ بھی چلا آیا تھا۔ آہستہ سے گاڑی روک کر بالکل دھیمے سے دروازہ بند کیا تھا۔ پھر وہیں کھڑے ہو کر اسے اوپر چڑھتے دیکھتا رہا تھا۔ اس نے بھی خط پوسٹ کرنا تھا۔ اس اتفاق پر اسے ہنسی بھی آئی۔

"آپ۔۔۔ آپ میرے پیچھے کیوں۔۔۔" اسے اٹک سی تو لگ گئی۔ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اور آگے تو بہ کرنا بعد سے الیل کروہ، بسکی کر میں ہی نوکر رہا تھا

"میں خط پوسٹ کرنے آیا ہوں۔"

"ڈالیں جلدی۔" وہ ایک طرف ہٹتے ہوئے بولی۔

"تم پہلے ڈالو۔" وہ ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہنے لگا۔ "تمہیں زیادہ جلدی ہو گی خط پہنچ جانے کی۔"

اور ایک خشمگیں نظر اس پر ڈال کر شانی نے ہاتھ میں پکڑا لفافہ [illegible] میں سرکا دیا۔
"کامران کو لکھا ہے شاید۔" پورا پتہ پڑھ لینے کے بعد بھی وہ انجان بن کر پوچھنے لگا۔
"آپ کام سے کام رکھیں۔" وہ تلخی سے بولی۔
اس نے دیکھا۔ آج وہ کچھ غیر معمولی خوش، بہت تیز اور ناراض ناراض لگ رہی تھی۔
اس نے کوٹ کی جیب سے لفافہ نکالا۔ دانستہ اس کی نظروں کے سامنے نچایا۔
"کام سے کام رکھ رہا ہوں۔" اس کی طرف دیکھے بغیر وہ دھیرے سے بولا۔
"یہ۔۔۔ یہ تو میرا ایڈریس ہے۔" وہی مخصوص نیلے رنگ کا لفافہ۔ وہی سفید [illegible]
اور اپنا ایڈریس دیکھ کر وہ لمحہ بھر کو جیسے کچھ سمجھ ہی نہ سکی۔ ہاتھ بڑھا کر جھپٹنے کی کوشش کرتے ہوئے بے اختیار بولی۔
"سو تو ہے۔" اس نے اس کا وہی ہاتھ پکڑ لیا۔ "یہ میری منگیتر کا ایڈریس ہے۔"
اور خط اس کی زد سے بچا کر جلدی سے جیب میں ڈال دیا۔
"آداب۔" حیران و پریشان کھڑی شانی کو کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع دینے سے قبل ہی وہ اُسے اچانک گود میں اٹھا کر آرام سے نیچے اتر گیا۔
"آپ تو غنڈے ہیں۔" وہ [illegible] آداب بھول گئی۔
"مجھے معلوم ہے۔" اس نے اُسے سیٹ پر ڈالا۔ دروازہ بند کیا۔ سامنے سے گھوم کر اپنی سیٹ پر آیا۔ اور ایکدم ہی گاڑی بھگا دی۔
"میں کہتی ہوں آپ سخت آوارہ ہیں۔" وہ آپے سے باہر ہو کر چیخی۔
ایسا بیہودہ انسان اس نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ اس کا ایڈریس حاصل کر کے کامران بن بن کر اُسے خط لکھتا رہا تھا۔ وہ بھی نادانستگی میں جواب پر جواب

دمیتے جا رہی تھی۔

اور پھر انس نے تو انس نے پریشانیوں سے گھبرا کر اسے اپنے دل کا حال بھی بتا دیا تھا۔ اسے زبردست شرمندگی کا احساس ہوا۔ جہاں اگر انس سے پیچھا چھڑا تا تھا۔ اور انس سے رخصت ہو کر بے انتہا اشفاق کی شامیں ... بتاتا تھا۔ پھر انس کے سامنے قسمیں اٹھاتا تھا۔ با قاعدہ جوڑتا تھا کہ پھر انس سے نہیں ملے گا۔ مگر آگے بڑھتے ہی سب کچھ ول مجال پھر اسے ہی پتہ ہوتا تھا۔ انس سے فون پر باتیں کرتا تھا۔ ملتا تھا۔ کار میں لفٹ دیتا تھا۔ سب کرتا تھا۔ دوران سب کے باوجود وہ بار بار یہ سوچ کر کھا جاتی تھی۔ اپنی بیوقوفی اور اس کی ڈھٹائی پر وہ کھول کھول اٹھتی۔

"اور کیا کیا ہوں؟" سامنے دیکھتے ہوئے وہ بڑے اطمینان سے بولا۔

"اوہ شٹ اپ۔"

"اور؟"

"آپ اوّل درجہ بدمعاش ہیں۔"

اور انس نے اپنی خوبصورت آنکھیں پوری کھول کر کہا۔

"لیکن ان سب کو اگر ملاؤ۔ تو بچارا کامران بن جاتا ہے۔"

ایک پل کو انس نے کامران کی طرف دیکھا۔ یقیناً بیا فراڈ تھا۔ پہلی ملاقات سے لے کر آج تک وہ طرح طرح سے جو تفتیش بتاتا آیا تھا اسے۔ مگر آج تو حد ہو گئی تھی۔ کامران بن بن کر اسے خط لکھتا رہا تھا۔ جواب میں انس کے خطوط بھی وصول کرتا رہا تھا۔ اور پھر

اس وقت خود کو کامران ہی بتا رہا تھا۔ اُسے لگا۔ آج زندگی کا سب سے بڑا نقصان اُس کے ساتھ کھیلا گیا ہے۔ وہ پھر بے بس ہونے لگا۔ دل بے تاب ہونے لگا۔

"مجھے گھر واپس لے جائیں۔" وہ بظاہر سپاٹ لہجے میں بولی۔

وہ دیکھ رہی تھی۔ اُس نے گاڑی قصبے سے باہر جانے والی سڑک پر ڈال دی تھی۔

"نہیں لے جاتا۔"

"پھر یہیں اتار دیں۔"

"نہیں۔"

"اوہ۔ آپ کیوں میرا پیچھا نہیں چھوڑتے۔" اُس کی آواز میں بے بسی سمٹ آئی تھی۔

"نہیں چھوڑوں گا۔"

"میرا پیچھا چھوڑ دیں......" وہ بازو میں منہ چھپا کر رو پڑی۔

"نہیں۔" وہ بے رحمی سے بولا۔

"مجھے اور تنگ نہ کریں۔" وہ مزید رو دی۔ "ورنہ میں زہر کھا لوں گی۔"

اُسے اِس اِنسان کی سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی۔ نہ اُسے چھوڑتا تھا۔ نہ اُس کا بنتا تھا۔ اور۔ اور

پھر اُسے خیال آیا۔ کامران۔ اُس کا منگیتر اس پورے معاملے سے الگ تھلگ ایک شخصیت تھا۔ اُسے خبر تک نہ تھی۔ خدا جانے کتنا بت کا سا اُداسی

نے کھیلا تھا۔

کہیں اس سے پیار کا دعویٰ بھی ایک مذاق تو نہیں تھا؟ اس سے مل کر۔ کسی طرح دل بہلا کر وہ چل دیتا تھا۔ یقیناً ایسا تھا۔

"اوہ پروردگار!" وہ جیسے تھک سی گئی۔ اس سے یہ گتھی نہ سلجھائی گئی۔ وہ مزید رونے لگی۔ قسمت اس کے ساتھ ایک عرصے سے عجیب و غریب کھیل کھیل رہی تھی۔

"میں کامران ہوں ثنا!" کار ایک طرف روک کر اس کا ہاتھ اپنے پہلو سے لگاتے ہوئے وہ اپنائیت سے کہنے لگا۔

"مجھے اور دھوکا مت دیں پلیز۔" وہ تو سرے سے یقین ہی نہیں کر رہی تھی۔ اور پھر اس کے اتنے گھنٹے چپ کے سبب کر تو وہ اسی قابل نہ رہی تھی کہ اس کا یقین کرے۔

"پلیز ثنا! میں ثنائی ہی پریشان ہو گیا۔ تو مجھے شبہ تھا کہ تم مجھے الگ اور اپنے منگیتر کو الگ شخصیت سمجھ رہی ہو۔ کیونکہ وہاں بھی ہم ٹھیک سے ملے نہیں تھے۔ پھر تمہارے یہاں آتے ہی ہماری منگنی ہو گئی۔ میں نے امی سے کہا تھا کہ ڈیڈی سے کہہ دیں۔ وہ رشتہ مانگ لیں۔ تم سے ایسا کوئی ذکر نہ کریں۔ کہ میں تم سے پہلے سے واقف ہوں۔ یہ بھی نہیں کہہ دیا۔ میں وہاں ڈیڈی کی بس رہا تھا۔ کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ تمہارے باباجان یا کوئی اور اس سے پہلے کی واقفیت کو غلط انداز میں سوچیں۔ پھر درمیان میں وقفہ بھی بہت کم تھا۔ میں یہاں آیا تو مجھ سی امید تھی کہ شاید تمہیں معلوم ہو چکا ہو۔ مگر پورا یقین نہیں تھا۔ تم سے ملا تو تم نے میرے شبے کی تصدیق

کردی تم واقعی لاعلم تھیں بچہ . . . .

پھر مجھے مزہ آنے لگا" وہ دھیرے سے ہنس دیا۔ اس کے بالوں پہ پیار کیا اور کہنے لگا "قدرت نے خوب ساتھی نہیں کیا" وہ پھر ہنس دیا۔ میں تمہیں اتنا فرینکلی سینے سے لگا لیتا تھا۔ بے تحاشہ پیار کرتا تھا۔ کسی غیر لڑکی سے اچانک اتنا فری سمجھا لیکن ہے کیا؟ . . . " ۔

ہنا۔۔۔ گھر جانے پہ مصر رہی۔ اس کے تو محسوسات گڈمڈ سے ہو رہے تھے۔ اور تو اُسے اس کے کامران ہونے پہ یقین نہیں آ رہا تھا۔ اگر یہی کامران تھا۔ تو اس کے خاکے کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ اس دنیا میں؟ اور یہ کیونکر ممکن تھا۔ وہ ایک عرصے سے اپنے منگیتر کا وجود مسلم سمجھتی آ رہی تھی۔ اور اس کو ۔ اسی کو تو چھوڑنا چاہتی۔ وہ خود کا باز سنگ سا تو ہی بچپن انوکھا۔ بچپن عجیب اور بہت پیارا سمجھ رہی تھی ۔

کیسے وہ ان دو شخصیتوں کو ایک سمجھ لیتی؟ اتنی جلدی اور اتنا اچانک ۔ اس کے ذہن و دل میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ کس کا انتخاب کرے اور کس کو ٹھکرا دے؟ ۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی ۔

"میں گھر جاؤں گی"۔ اُسے فرار کا یہی راستہ نظر آیا۔ آنسو پونچھتے ہوئے وہ سنجیدگی سے بولی۔

"میں نہیں لے جاؤں گا"۔ اُسے پہلو میں بیٹھے لیے وہ خوشدلی سے بولا۔

"میں خود چلی جاؤں گی"۔ اس کی گرفت سے اپنے کو چھڑاتے ہوئے وہ جذبات سے عاری آواز میں بولی ۔

"اوہ"۔ وہ اچانک اداس ہو گیا۔

اُسے اپنا تعارف کرا دینے کے بعد شاید انس کے محسوسات ابھی بہت نازک ہو گئے تھے۔ یا

پھر۔ شاید منگیتر ہونے کے ناطے وہ کچھ زیادہ ہی توقع کرنے لگا تھا۔

"نہیں۔ میں چھوڑ آتا ہوں"۔ وہ گمبھیر آواز میں بولا۔

اور گاڑی کا رُخ واپس موڑ لی۔

دوبارہ انس سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ بھی خاموشی سے اپنے گیٹ پر اتر گئی۔

"خدا حافظ" کامران نے دُور سے کہا۔

"خدا حافظ"۔ انس نے سُرخ سُرخ آنکھوں سے کامران کی طرف دیکھا۔

انس کی نظروں میں منسوب ہونے کی شکایتیں تھیں۔ بے یقینی تھی۔ اداسی تھی۔ پھر

یقین کا شعور سے کم۔ اعتبار کا اعتماد کا کوئی شائبہ نہ تھا۔

۴۳

کبھی اُسے لگتا۔ وہ واقعی کامران ہے۔ انس کا منگیتر۔

انس کے سنگ بیٹھ کر اُس کی باتوں کی صداقت پر غور کیا کرتا۔

پھر کبھی اُسے لگتا۔ یہ ناممکن تھا۔ یہ بھی ایک خواب تھا۔ سارا وقت سوچتے

سوچتے سوچ کر نڈھال سی ہو گئی۔

کبھی اُسے خیال آتا۔ واقعی وہ کتنی بے تکلفی سے آ کے سینے سے لگا لیتا تھا۔

کبھی کبھی تو خود اُسے بھی اس کے بے تحاشہ پیار کرنے پر۔ اس کی دیری پر حیرت ہونے لگتی۔ یہ سوچتے ہی وہ سوچ میں پڑ جاتی۔ اور

پھر اُسے ضرورت بھی کیا تھی، اُس کا شکریہ ادا کرنے کی؟

اتنا بڑا جھوٹ۔ اتنا زبردست مذاق!

اور پھر وہ خود ہی ہنس پڑتی

یہ جھوٹ اُس کے نزدیک بالکل بڑا نہیں تھا۔ نا ہی یہ مذاق اس کے سامنے اتنا زبردست تھا۔ وہ تو۔ وہ تو بہت کچھ کرتا تھا۔ بہت کچھ کرتا تھا۔ اُسے اکثر پچھلی حرکتیں یاد آتیں جب اس کے امتحان نزدیک تھے۔ اور وہ رمیز سے وہ الٹی باتیں اور الٹی حرکتیں کرتا تھا۔ لیکن

پھر اچانک اُسے یاد آیا۔ ایک خط میں اس نے اپنی آمد کا لکھا تھا۔ اس تاریخ کو

اسی دن کو

وہ اس کی آمد کی متوقع تھی۔ دن سارا گزر گیا تھا۔ مگر وہ نہیں آیا تھا۔ پھر شام کو وہ ہی ملنے آ گیا تھا۔ جسے دیکھ کر اس کا دل دھڑک اٹھا۔ خط میں لکھے ہوئے دن اور تاریخ کے مطابق تو کیا کامران۔ تو آیا ہی نہیں تھا۔ پھر

اُسے کچھ کچھ شبہ ہونے لگا۔ پھر کئی ملاقاتیں یاد آئیں۔ کئی دوسری باتیں۔ پہلی ملاقات میں جس بیقراری سے وہ اُسے ملا تھا۔ اور پھر سرباب ہی ملنے پر اس کا اُسے بے تحاشہ پیار کرنا۔ سب یکے بعد دیگرے اس کی نظروں کے آگے گزرنے لگے۔

اور

اس کے شبہے کو تقویت ملتی رہی۔ اور پھر کوئی مکمل ثبوت حاصل ہونے کے

باد جود اُسے کشیر سے غصہ آ گیا۔ جبکہ اُس نے محسوس کیا۔ اب کے جیلسی اپنے عروج پر تھی۔ دل اُسے آہستہ آہستہ کامران مان رہا تھا۔ ذہن ابھی مزید دلائل سوچ رہا تھا۔ کہ جیلسی منظر سے گئی۔

اگر وہ کامران تھا۔ تو اُس کی منگیتر ہونے کے ناطے وہ اُس پر پورا پورا حق رکھتی تھی۔ وہ صرف اور صرف اُس کا حق بنتا تھا۔ کل تک تو وہ اُسے صرف اپنا پیار۔ وہ بھی مجبور پیار سمجھ کر اُس کی نائیلہ سے ملاقاتوں پر خاموش تھی۔ خاموش تو کیا بلکہ خاموش رہنے پر مجبور تھی۔ اُس کی دانست میں وہ کسی اور کی امانت تھی۔ اس لئے وہ اُس پر زبردستی نہیں کر سکتی تھی۔

مگر اُسے تو علم تھا کہ وہ ہی اس کا منگیتر ہے۔ پھر وہ نائیلہ سے کیوں ملتا جلتا تھا؟ کیوں اُس کے فون ریسیو کرتا تھا؟ اور کیوں اُسے کار میں لفٹ دیتے پھرتا تھا؟؟۔

اتنے عرصے کا برداشت کیا ہوا اشتعال اُس وقت طوفان بن کر امڈ پڑا۔ وہ تو اُسے صرف اپنا پیار سمجھتے ہوئے بھی نائیلہ سے اس کا میل جول برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ چہ جائیکہ اُس کا منگیتر ہو کر وہ اُس کے ساتھ گلچھرے اُڑاتا پھرے۔

کچھ دن اور گزر گئے۔ اُس کا اشتعال بڑھتا ہی رہا۔ اب تو ہر وقت اُس کی آنکھوں میں اُس کا نائیلہ کے ساتھ باتیں کرنا۔ ڈانسنگ کرنا۔ فون اور دوسرے واقعے گھومتے رہتے۔ اب تو وہ اُس کے سارے مذاق یا دوسرے لفظوں میں بقول اُس کے بجائے فریب معمول بھال گئی تھی۔

بس ایک ہی بات یاد رہ گئی تھی۔ اور وہ تھی نائیلہ اشفاق سے اُس کی ملاقاتیں۔

"نائلہ اشفاق کے یہاں۔ انس نے مجھے بلایا تھا۔" ایک دن کس اطمینان سے

وہ بولا تھا۔

انس کی ہر بقدر وسعت کاجی نائلہ نے اسے سبایا تھا۔

جانے کیوں؟ وہ کسی طرح بھی برداشت نہیں کر پارہی تھی۔ اس سے بے تحاشہ

پیار تھا شاید۔ اور

یا پھر۔ اب اسے یہ معلوم ہو گیا تھا۔ کہ وہ بھی اس کا منگیتر بھی ہے۔ جبھی

شاید جیسی نادان کر چھوٹ نکلی تھی۔ وہ انس کا منگیتر کامران ہی تھا بلکہ ہی وہ اپنی

امی کو لے کر آیا تھا۔ اب کے گاڑی سیدھی گیٹ سے لاکر بے تکلف پورچ میں لا کھڑی

کردی تھی۔

تمام نوکروں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ اور بقول ماما ان کی تو دلی مراد بر آئی

تھی۔ وہ تو اسے دیکھ انس کے نئے دل ہی دل میں پسند کر آئی تھیں۔ کیا عجیب اتفاق تھا؟

امی اوپر انس کے گرم گرم بیڈ روم میں بیٹھی تھیں۔ اور وہ نیچے ڈرائنگ روم میں

بڑی بڑی لکڑیوں کی جلتی آگ تاپ رہا تھا۔ "امی پلیز! مجھے اوپر بلا لیں"۔ وہ گھڑی

گھڑی سیڑھیوں تک آکر ہانک لگاتا۔

"بیٹے بس بھی کرو اسے شرم آرہی ہے"۔ امی نے انس کے سرخ چہرے سے

یہی اندازہ لگایا تھا۔

امی کی موجودگی میں ایسی ہانک پر وہ واقعی سرخ ہو گئی تھی۔

پرتکلف چائے پی کر وہ لوگ شام کے وقت رخصت ہونے لگے۔ تو امی کے

ساتھ وہ بھی پورچ میں کھڑی کار تک آگئی۔

"کل میری برتھ ڈے ہے آؤ گی نا؟" امی کو سمجھا کر دروازہ بند کرتے ہوئے اُس نے سب کی نظریں بچا کر دھیرے سے کہا۔

اور وہ اُسے کوئی جواب دیئے بنا امی کو "خدا حافظ" کہہ کر پچھلی سیٹ آ بیٹھی۔

وہ کچھ سا گیا۔ اور پھر کھسیانا سا منہ لئے کار میں بیٹھ کر چل دیا۔

"خود تو انا حساس بنتا ہے۔ دوسروں کے جیسے دل ہی نہیں" اُس نے سوچا اور اوپر چلی آئی۔ اُس نے نائلہ اشفاق کو بھی بلایا ہوگا۔ یقیناً۔ وہ کبھی بھی اُس کی برتھ ڈے پر نہیں جائے گی۔ اُس نے عزم کر لیا۔

پھر رات کو اُسے اُس کا برتھ ڈے کارڈ بھی ملا۔ اُس نے کتنا خوبصورت تحفہ اُسے اُس کی برتھ ڈے پر دیا تھا۔ ایک پل کو اُسے خیال آیا۔ مگر پھر اُس نے یہ خیال جھٹک دیا۔

کیوں وہ ہر بار ہی اُس کی ناراضگی کے باوجود نائلہ سے ملنے پہنچ جاتا تھا؟۔

رات اُس نے فون بھی کیا۔ اُس کے آنے پر اصرار بھی کیا۔ مگر اُس نے فون ہی بند کر دیا۔ وہ تو اُس سے ناراض تھی۔

شدت سے۔ وہ تو پہلے بھی اُس کے نائلہ سے میل جول پر اُس سے روٹھتی تھی مگر جب اُسے علم ہوا کہ وہ ہی اُس کا منگیتر ہے۔ اور اچھی طرح سب کچھ جانتے بوجھتے کر نائلہ سے ملنے جاتا ہے۔ تو اُس کی ناراضگی مزید گہری ہو گئی۔ بلکہ وہ تو کامران کی نائلہ کے متعلق باتیں یاد کر کر کے کڑھتی رہی۔ کیا وہ منگیتر ہونے کے ناطے ذرا بھی اُس کا پابند نہیں تھا؟۔

امی نے اس کا نام نا شرم سے تعبیر کیا۔ مگر کامران نے دل ہی دل میں اس کی پہلی بار آمد کا جو حسین تصوراتی محل تعمیر کیا تھا۔ وہ چکنا چور ہو گیا۔

ایک پل کو تو وہ سہم سی گئی۔

"جتا لیجئے نا خوشی منع کس نے کیا تھا؟" ایک تو نائلہ سے برابر جلتا رہتا تھا۔ اوپر سے رقیب بھی ڈانٹا تھا۔ سنبھلتے ہوئے اس نے بھی کہہ دیا۔

"اوہ ... میں ... میں ...." وہ اس سے اتنی تلخ باتوں کی توقع نہیں رکھتا تھا۔ مارے غصے کے کچھ بول ہی نہ سکا۔

ادھر شمائل نے ریسیور کریڈل پہ ڈال دیا۔ سلسلہ منقطع پا کر تو کامران مزید مشتعل ہو گیا اور پھر رات بھر اسے نیند ہی نہ آئی۔

وہ کتنا بے تحاشہ چاہتا تھا اسے۔ کیا وہ اندازہ نہیں کر سکتی تھی؟ اگر اب تک اسے یہ معلوم نہ ہو سکا تھا کہ کامران دل ہی دل میں اسے چاہتا ہے تو اس میں اس کا اتنا بھی قصور نہیں تھا۔ حالات اور واقعات ہی کچھ ایسے پیش آ گئے تھے۔ پھر اگر اس نے مذاق کو تھوڑا طول دے ہی دیا تو اس میں ایسی کون سی خطا سرزد ہو گئی تھی جس کی تلافی ناممکن ہو کر رہ گئی تھی۔

رہی نائلہ اشتیاق کی بات۔ تو وہ بھی صرف اتفاقات اور حالات پہ منحصر تھا۔ شروع میں تو وہ اسے کچھ بھی نہ سمجھتی تھی۔ پھر جان گیا کہ وہ اس میں دلچسپی لیتی ہے۔ تو اس نے اسے صاف صاف بتا دیا تھا کہ اس کی منگنی ہو چکی ہے۔

شمائل نے اگر دونوں کو اکٹھے ٹیبل شیئر کرتے دیکھا بھی تھا۔ تو اس میں اسکی مرضی کو تو دخل نہیں تھا نا۔ نائلہ ہی نے اس کا پیچھا لیا تھا۔

پھر فون پر اسے شمائل کی برجستہ جملے بازی کا قلق تھا اسے ہنسنے سے باز رکھا تھا۔

مگر اس نے دل میں معذرت کر لی تھی۔ شمائل کو تو از راہِ مذاق اور محض اس خیال سے کہ اسے جتا کر اس سے اپنے پیار کا اقرار اگلوائے گا۔ اس نے یہ بات بڑھا دی تھی

کے سامنے رکوائی۔ اور تیز تیز قدم اُٹھاتی اندر داخل ہو گئی۔

وہیں اُسے امی نظر آئیں۔

"آداب امی"۔ اُس نے پاس جاتے ہوئے عقیدت سے کہا۔

ساتھ ہی قریبی شیلف کے پاس کھڑے کامران نے گھوم کر دیکھا۔

امی تو شانی کے ساتھ باتوں میں لگ گئی تھیں۔ مگر شانی نے دیکھا۔ کامران پہلے سے کہیں زیادہ اداس تھا۔ نظریں ہزاروں شکوے لیے تھیں۔

"کامران انکل مجتبائی شیخ احمد پہنچ رہے ہیں"۔ امی نے اُسے متوجہ دیکھ کر کہا

"بڑی خوشی کی بات ہے۔ اب یہ اکیلی نہیں رہیں گی"۔ وہ ایک قدم چل کر ان سے آ ملا۔ مگر لہجہ اب بھی گہری سنجیدگی لیے تھا۔

"کتنے بجے پہنچ رہے ہیں۔ ہم بھی لینے ایئرپورٹ جائیں گے"۔ امی نے مزید پوچھا۔ "کیوں بیٹے؟"۔ وہ کامران سے مخاطب ہوئیں۔

"ضرور امی"۔ وہ اب بھی اداس تھا۔

شانی بے چین ہو گئی۔

تھوڑی دیر وہ مختلف شیلفوں پہ نظریں دوڑاتا رہا۔ شاید امی کا منتظر تھا۔ مگر انھیں مصروف دیکھ کر وہ باہر کی طرف چل پڑا۔

شانی نے دیکھا اداسی کے ساتھ ساتھ وہ جھنجھلایا جھنجھلایا سا بھی تھا۔

پھر کل چار بجے وہ ساٹھ میل طے کر کے ایئرپورٹ پہنچی۔ تو امی اور کامران پہلے سے وہاں موجود تھے۔

کامران نے بابا جان کو خوش آمدید کہا۔ بابا جان نے اُسے سینے سے لگا لیا۔

بابا جان کامران کی کار میں اس کے ساتھ آگے بیٹھ گئے۔ اور اپنے ڈرائیور

کو گفتگو ختم کرتے ہوئے شانی کو اسی کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کو کہا۔ کامران نے خاموشی سے اس کی آنکھوں میں دیکھا مگر نظریں اب بھی اداسی اور بے بسی کا شکوہ لیے تھیں۔

وہ گھبرا کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

کامران نے پہلی بار بابا جان کے انداز میں شاندار دعوت دی تھی۔ شانی کو بابا جان کے سامنے مجبور ہونا پڑا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ وہ اب تک کامران سے ناراض تھی۔ چند دنوں کے سوچ بچار، ذہن، دل کے دلائل سے وہ اس کی بے گناہی کی قائل ہو گئی تھی۔ بلکہ یہ بھی نہیں تھا۔ اس کے ساتھ بے تحاشہ پیار نے اسے معاف کروا دیا تھا۔

اب تو ایک جھجک سی۔ ایک ہم سی۔ مانع تھی اس کے اور کامران کے درمیان۔

وہ جانتی تھی کہ اس سے پھر ملے بغیر ڈھیر ساری باتیں ہیں۔ DASHING PERSONALITY اور مسحور کن باتوں والا شخص اب اس کا اپنا تو تھا مگر۔ وہ تو ناراض تھا بری طرح۔

پھر اس کی بھی FEELINGS اچانک کچھ اور سی ہو گئی تھیں۔

وہ اس کا منگیتر تھا۔ اس سے عمر میں بڑا تھا۔ اس کے لہجے میں فتح کے انکشاف کے بعد اچانک تحکم سا ابھر آیا تھا۔ وہ پہلے سے اسے یکدم ہی کچھ اور لگنے لگا تھا۔ بڑا۔ باس قسم کا۔ مدبر۔ رعب داب والا۔

مگر پھر بھی اسے پیارا تھا پہلے سے زیادہ۔ بلکہ اب تو وہ اسے اس انکشاف کے بعد اور بھی زیادہ پیار کرنے لگی تھی۔

پیار جس میں بہت کچھ شامل ہو گیا تھا۔ عزت بھی۔ کچھ ادب بھی۔ شوخی بھی۔ کچھ سہم بھی۔

اور اب بھی سہم تھی شاید۔ کہ وہ اُس کا سامنا کرنے سے خائف تھی۔ اُس کے ساتھ خفگی سے جو بخشش آئی تھی۔

مگر بابا جان کے آگے اُس کی ایک نہ چل سکی۔ بابا جان تمام خوش تھے۔ کامران نے جہاں گرمجوشی سے بابا جان کا خیر مقدم کیا۔ وہاں اُس کی آنکھوں میں بھی بغور دیکھا۔ مکمل ناراض نظروں سے

وہ دلبری سے مسکرا دی۔

اتنا لمبا چوڑا سیچر یہ سنجیدگی رکھنے کے باوجود وہ اُس وقت بہت معصوم لگ رہا تھا اُسے

بہت سے نوکر چاکر موجود ہونے کے باوجود وہ مختلف ڈشیں خود ہی بابا جان کو پیش کرتا رہا۔ ہر بار اُس کے پاس بھی آیا۔ چپ چاپ خاموشی سے ہر بار ہر چیز اُس کی پلیٹ میں خود ہی ڈالتا رہا۔ مگر منہ سے ایک لفظ بھی نہیں بولا۔ شانی کی پوزیشن عجیب سی ہو گئی تھی۔ کبھی اُسے ہنسی بھی آ جاتی۔ اچھی ناراضگی تھی یہ بھی۔

وہ کوئی بات نہ کر سکی۔ کہ وہ تو ناراض تھا۔ اُسے بات کرنے کا موقعہ ہی نہیں دے رہا تھا۔

اور پھر یوں ہی ہوتا رہا۔ وہ جگہ جگہ اُسے ملا۔ مگر شانی سے بات نہیں کی۔ اداس اداس اور ناراض ناراض رہتا۔ شانی کو بھی خودداری آڑے آ رہی تھی۔ وہ پہل کرتا تو وہ بولتی نا۔

پھر اچانک ہی ایک دن انہیں اطلاع ملی۔ کہ کامران رائیڈنگ کرتے ہوئے گھوڑے سے گر کر زخمی ہو گیا ہے اور ہسپتال میں ہے۔ بابا جان جلدی میں تھے۔ اکیلے ہی چل دیئے۔

اور کامران کی ناراضگی مزید بڑھ گئی۔ کیا ایسی حالت میں بھی وہ اسے دیکھنے نہ آ سکی۔ کیا ایسی ہی انکی محبت تھی آپس میں؟ - ناراضگی اور نفرت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ اس نے جھنجھلا کر سوچا۔ اور پھر اس کی ناراضگی غصے میں بدل گئی۔

ثنا بے چینی سے وقت گزار رہی تھی۔ بابا جان نے اسے ساتھ چلنے کو نہیں کہا تھا۔ اور خود سے پہنچنے کی اس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔

اس نے ماما سے سنا تھا۔ اس کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ پلاستر چڑھا دیا گیا تھا۔ اور اب اسے آرام تھا۔ مگر

اسے کسی کل چین نہیں پڑ رہا تھا۔ اور آج اسے احساس ہوا وہ اسے پیار کے نام نہ جانے کب سے ساتھ چاہتی تھی۔ خود داری اور ضد کو ایک طرف نکال کر چاہتی تھی بھاگ کر اس کے پاس پہنچے۔ اس سے لپٹ کر اس سے اپنی زیادتی کی معافی مانگ لے۔

شام ہو رہی تھی جب وہ بے چین ہو رہی تھی۔ کھڑکی میں کھڑی ڈوبتے سورج کو دیکھ رہی تھی۔ فضا میں ہر طرف کہیں بکھری زردی تھی۔ خود رو جھاڑیوں، درختوں اور چنار کے پتوں پر کی برف پگھل کر بہہ چکی تھی۔ دور اونچے سربلند پہاڑوں کی چوٹیاں البتہ اب بھی برف سے ڈھکی ڈوبتے سورج کی روشنی منعکس کر رہی تھیں۔

تبھی وہ ماما کی آمد پر چونکی ۔

"بیٹی! صاحب کہہ رہے ہیں آپ بھی جا کر کامران صاحب کو دیکھ آئیں۔"

وہ جھٹ سے تیار ہوگئی ۔ تمام خودداری اور ضد پس پشت ڈال کر

ہسپتال پہنچ کر وہ موٹر سے اتری ۔ اندر داخل ہوئی ۔ لاؤنج میں لگے

ہوئے روم نمبرز کے انڈیکیشن بورڈ پر نظریں دوڑائیں ۔

"کامران روم نمبر ۸" اور وہ پل میں ہی اس کے دروازے پر پہنچی ۔

"ہمیں آنا منع ہے" ۔ اس کی ہلکی سی دستک پر اس کی بھاری سی آواز سنائی

دی ۔ اور وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اندر داخل ہوگئی ۔

سامنے ہی وہ چوڑی کھڑکی کے آگے لگے صاف شفاف بستر پر دراز تھا ۔

نیلی کرتوں جیسے اس نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ رکھے تھے ۔ اس کا چہرہ

زرد اور آنکھیں تو بہت سے بند تھیں ۔ ایک طرف ماتھے پر بھی ڈریسنگ بندھی تھی

دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں ۔ ایسی حالت میں وہ پہلی بار

اسے دیکھ رہی تھی ۔

آہٹ پر کامران نے دھیرے سے آنکھیں کھول دیں ۔ اس کی آنکھوں میں ایک

پل کو قندیلیں سی جل اٹھیں ۔

مگر پھر ۔ قندیلیں بجھ گئیں ۔ تاریک سے سائے لہرانے لگے ۔ ایک جھکے کو

وہ ٹھٹھک کر رک گئی ۔ نظریں جھکائے مجرم سی کھڑی ہوگئی ۔ آگے جانے کی

ہمت ہی نہ رہی ۔

تبھی کامران نے آنکھیں بازو سے ڈھک لیں ۔ اس سے ناراض جو تھا ۔ اور

شاذ دھیرے دھیرے سے چلتی اس کے بستر تک آگئی ۔ یہاں پہ وہ رک گئی ۔ پھر جھکتے

جھجکتے آہستہ سے اُس کے پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئی۔

دل بے تحاشہ دھڑک رہا تھا۔ ہاتھوں تک میں لرزش تھی۔

اور۔ اسی وقت اُسے احساس ہوا۔ ایک عام آدمی سے ملنا الگ بات تھی۔

اور شکیل کا سامنا کرنا مختلف بات تھی۔ بڑی مشکل۔ بہت ہی بڑی۔

وہ چپ چاپ بیٹھی اپنی لرزتی انگلیوں کے ناخنوں کو بے مقصد تکتی رہی۔

کئی لمحے بیت گئے۔ وہ تو جیسے بولنا ہی بھول گئی تھی۔ اور

اُس کا تذبذب۔ گھبراہٹ۔ اور سٹپٹاہٹ بھانپ کر کامران کو اُس پر

ترس آ گیا۔ ناراضگی تو بچوں جیسی رہی۔ وہ اُس کے پاس بلا کر آئی تھی کیا بچوں سے

بن بلائے یہ ملنا کم تھا؟

"کیسے آنا ہوا؟" آنکھوں پر سے بازو ہٹاتے ہوئے مسکرا کر وہ کچھ کھنچے لہجے

محبت کے ساتھ بولا۔

"میں ۔ ۔ ۔ میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" اور ساتھ ہی اُس کی طرف دیکھتے دیکھتے آنسو

ڈھلک کر اُس کے گالوں پر آ رہے۔ "روتی کیوں ہو؟" اُس کا ہاتھ تھامتے ہوئے

اُس نے اُسی لہجے میں پوچھا۔

"آپ ۔ ۔ ۔ آپ ۔ ۔ ۔ ۔" وہ اور بھی رو دی۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟" وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

اُس کا دل اُس کے جسم سے بھی زیادہ نازک تھا۔ ذرا سی دیر پڑتی تھی۔

"آپ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ کیسے ہیں؟" دوسرے بازو میں منہ چھپاتے ہوئے وہ

بچوں کی طرح ہچکیاں لے لے کر بولی۔

"اوہ" ۔ اسے بے اختیار ہنسی آ گئی۔

تو ناز کے سی جان واقعی اس کی عیادت کو آئی تھی ۔ بالکل یوں پوچھا تھا۔
جیسے اپنی الفاظ میں نہ پوچھا تو وہ کچھ ناراض ہو جائے گا ۔

"کس نے سکھایا تھا ایسا کہنا؟" اپنی معصوم سی جان سے جانے کیوں ؟
اسے اتنی بڑی بات کی توقع نہ تھی ۔ اس کا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے
اس نے حیرت سے پوچھا ۔

"ماما نے کہا تھا ۔ میں خود بھی اسی لئے آئی ہوں" اس نے جلدی سے
کہا۔ مبادا صرف ماما والی بات پر برا مان جائے ۔

"جبھی اسے پوچھنا فرض ہو ، یہ نہ ہو جیسا کہ اسی طرح ، بس اٹھا دیا" انہوں
نے اسے کبھی اپنا فرض سمجھا تھا ۔ اپنے سگنیچر کو پورا کئے جا رہی تھی نا ۔ وہ نہ سمجھا نہیں
تو کون تھا اور اسے سمجھانے والا ؟

اور کامران کو اس کی معصوم ادا بے خود کر گئی ۔ ہاتھ بڑھا کر اسے دھیرے
سے اپنے سینے پر گرا لیا ۔

"سبھی کبھی بالکل چھوٹی لگتی ہو ۔ دو تین سال کی ۔ اور کبھی بہت
بڑی ۔ رعب ڈالنے والی ۔ میں تو سمجھا تھا مر بھی گیا تو بھی نہیں آؤ گی ۔ جلدی ہو نا
بہت ۔" اسے سینے سے لگائے ہاتھ سے اس کے بال سہلاتے ہوئے وہ
اپنائیت سے کہتا گیا ۔ اور وہ مزید رونے لگی کیسی بات کر رہا تھا ۔ وہ مر جاتا
تو وہ زندہ رہتی بھلا ۔

"تم کیوں نہیں بولتی تھیں شیبی ؟ کیوں نہیں میری برتھ ڈے پر آئیں ؟"
اس کا چہرہ اٹھا کر اس کی روتی آنکھوں پہ پیار کرتے ہوئے اس نے شاکی
لہجے میں کہا ۔

اور شانی کا پارہ پھر چڑھنے لگا۔

"کیوں رکھا تھا انس نے ہاتھ؟" - اس نے اس کے بال مٹھی میں بھر کے کہا انس نے جھنجھوڑ دیئے۔

"باپ رے"۔ وہ خوشدلی سے ہنس دیا۔ "اب سے نیا سال ہے۔ آگے جانے کیا کیا ہو؟"

اور شانی کو انس کے لب و لہجے پر ہنسی آ گئی۔

"پھر آپ نے اسے گھر میں ڈراپ کیا تھا؟" وہ پھر بولی۔

"خاصی چوکیدار قسم کی بیوی پائی ہے۔" وہ شرارت سے بولا۔ "میں نے اسی سے معذرت کر لی تھی۔ اکیلی لڑکی کو لفٹ دینا میرا اصول نہیں۔"

اور شانی کو ہنسی آ گئی۔

"تمہیں اگر لفٹ دی تھی۔ تو تم مجھے اچھی لگتی تھیں۔ نہ اس سے پہلے یہ کام کیا ہے۔ نہ آئندہ ایسا ارادہ ہے۔ آؤ اب پیار کریں۔" وہ اسے زور سے لپٹاتے ہوئے شرارت سے بولا۔ اور شانی کی سانسیں پھر اکھڑنے لگیں۔

"ایک بات بتاؤ۔" تھوڑے سے توقف کے بعد وہ پھر سے بولا۔

"کیا؟"

"سچ سچ کہو گی؟"

"ہاں۔"

"میں اچھا لگتا ہوں؟"

"نہیں۔" اس نے سر نفی میں ہلا دیا۔

"اپنا منگیتر؟"

"وہ بھی نہیں۔"

"پھر؟" وہ اُس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

"بتاؤں؟" اُس نے بڑی ہمت کی۔

"ہاں"۔

مگر اُس کی معنی خیز نظروں سے نظریں ملتے ہی اُس کی پلکیں ایک بار پھر جھک گئیں۔ اتنی بڑی بات۔ بالکل براہِ راست۔۔ وہ چپ ہو گئی۔

"بتاؤ نا" اُس نے اصرار کیا۔

"بس ایک آدمی اچھا لگتا ہے" اُس کے سینے میں منہ چھپاتے ہوئے اُس نے شرماتے شرماتے کہہ دیا۔

"کون ہے وہ آدمی؟" اُسے بازوؤں میں بھر کر اُس نے پھر بھینچ لیا۔

"بیوقوف"۔ اُس کے سینے میں منہ چھپائے اُس نے پھر سے کہا۔

"نام نہیں آتا؟"

"بیوقوف"۔ اور ساتھ ہی زبردست ٹھنکا تھا ننھی سی۔

شانی چونک کر سیدھی ہو بیٹھی۔

کامران نے اُس طرف دیکھا۔ نعیم اُن کی طرف مکمل پیٹھ کیے اب بھی کھڑا تھا۔

"اب آ ہی گئے ہو تو بیٹھ ہی جاؤ"۔ کامران پہلے لفظ "بیوقوف" اور پھر نعیم کے پیٹھ کر کے کھڑے ہونے پر ہنسے بنا نہ رہ سکا۔

"آداب بھائی"۔ وہ فوراً مڑتا اُن کی طرف کرتے ہوئے خوش دلی سے بولا۔

"دیکھو نعیم! بھائی" تم نے کہا ہے۔ اب روٹھ گئی تو منانا تمہارے ذمے"۔ وہ سنبھلتے ہوئے دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھتے ہوئے بولا۔

"تو کیا تمہارا بھی ایسا کوئی ارادہ تھا کہنے کا؟" نعیم سنجیدگی سے بولا۔ اور پھر کامران کے ساتھ ساتھ نعیم بھی قہقہہ لگا اٹھا۔

شانی شرم سے سرخ ہوتی جا رہی تھی۔

"بھائی! آپ کو کیا معلوم ہم دونوں پہ کیا بیتی؟ جب آپ نے لکھ بھیجا۔ کہ آپ اس منگنی پر آ نہیں رہ سکتیں"۔

شانی کا سر مزید جھک گیا۔

"نعیم پلیز..."

"اچھا ہے۔ میری اپنی بھابی ہیں۔ تمہیں کیا مجھ سے زیادہ پیاری ہیں"۔

کامران جزبز ہو کر رہ گیا۔

"شانی تم مائنڈ نہ کرنا۔ اس کی عادت ہے"۔

شانی نے جھجکتے جھجکتے ایک نظر نعیم کو دیکھا۔ اور پھر سر دوبارہ جھکا لیا۔

"بھابی! یہ آپ سے بہت ڈرتا ہے"۔

اور کامران نے آگے سے مکّا تان کر دکھایا۔

"مکّے کیوں دکھاتے ہو"۔ وہ لاپرواہی سے بولا۔ "ویسے بھائی آپ کو شاید... بھی بہت کرتا ہے۔ جیسے آپ کو دیکھا تھا اس نے۔ ساری ساری رات جاگتا رہتا تھا۔ ہر وقت بھاگا آتا تھا۔ کہتا تھا "کچھ کرو نعیم ورنہ مر جاؤں گا"۔

"بس کرو۔ جھوٹ کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔"

"تو تم انہیں پیار نہیں کرتے؟"

کامران نے شپٹا کر جیب ہو رہا۔

"نہیں کرتے؟" وہ جیسے دھمکی دینے کے انداز میں بولا۔

"کرتا ہوں۔۔۔" وہ خوبصورتی سے جھینپ دیا۔

"پیار کر کے دکھاؤ۔" وہ شرارت سے باز نہیں آ رہا تھا۔

"تم جاؤ یہاں سے۔"

"تو میں دیوار کی طرف منہ کر لیتا ہوں۔" اس نے سچ مچ رخ دیوار کی طرف کر لیا۔

"اوں ہوں۔ ایسے کام نہیں چلے گا۔"

"تو ضرور چلا جاؤں؟" دیوار کی طرف رخ کیے نعیم بولا۔

"ہاں"۔

"لو جاتا ہوں۔ لیفٹ رائٹ، لیفٹ رائٹ۔" وہ باقاعدہ مارچ کرتا ہوا چل دیا۔

"ذرا آؤ تمہیں پیار کروں"۔ اس کا جھکا سر سینے سے لگاتے ہوئے وہ شرارت سے بولا۔

پورچ میں کھڑی وہ اپنی خوبصورت سپورٹس کار کی طرف بڑھی۔ مگر دوسرے ہی لمحے وہاں کھڑے وہ اجنبی گارڈز کو اپنی طرف گھورتے دیکھ کر...... وہ پیچھے ہٹ آئی۔ احساس ندامت سے اداس چہرے پر زردی گھنڈ آئی۔ بحرینت کے خیال سے خوبصورت آنکھوں میں کرب اتر آیا۔

◎ سحا...... وہ مرغیوں کی پھڑ پھڑاہٹ سے چونکی۔ مڑ کر دیکھا۔ ایک کے بعد دوسری۔ مرغیاں بڑے مزے سے وین سے نیچے کود رہی تھیں۔ اس نے فوراً گاڑی روک لی۔ نیچے اتر آئی ''کہاں جا رہی ہو؟''۔ وہی آدمی تھا اس شام والا جسے پھپھو نے اسے لینے ایئرپورٹ بھیجا تھا۔

''پولٹری ویلے''۔ ''کون باقی رہتا ہے؟'' ''مالک باقی رہتا ہے''۔

''لائسنس بھی ہے تمہارے پاس؟''

''کیوں''؟

''مالک کے یہاں جاؤ گی تو وہ لائسنس دیکھے بغیر گھسنے دے گا؟''

◎ تصوراتی تصور میں اس نے اُسے اپنے پیار کے اظہار پر بچوں کی طرح تالیاں پیٹتے دیکھا تھا۔ کئی بار پولیس سٹیشن فون کرنے دوڑتے دیکھا تھا۔

◎ باہر شام کے سائے سلگتے ہو رہے تھے۔ نیچے جزیرے پر کئی بتیاں جگ مگ کرنے لگی تھیں۔ جہاز اپنے منزل مقصود کے آس پاس منڈلا رہا تھا۔